اگست
۲۰۰۴

مؤسس

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر

پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

کشمیر زخم ہے اور مرہم آپ کے پاس











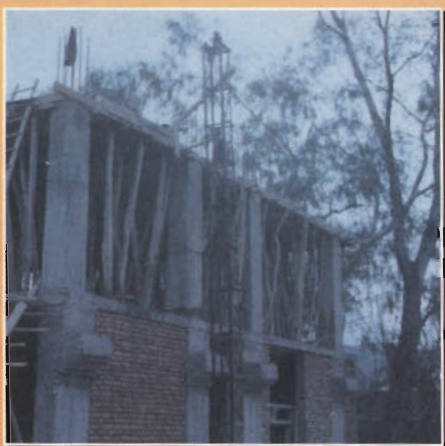


زخمی بیمار اور نادار کشمیری مہاجرین اور مجاہدین کے زخموں پہ مرہم رکھیے۔

کشمیر سرجیکل ہسپتال (زیرانتظام پیما) سے تعاون کیجیے۔

خدمت انسانیت کے 11 درخشاں سال (اکتوبر 1990 تا اکتوبر 2001)

آپ کے تعاون سے اب تک -/47863177 روپے خرچ ہوئے۔



ضروریات

ہر ماہ ادویات کی ضرورت 5 سے 7 لاکھ روپے

تعمیرات (صدقہ جاریہ)	تخمینہ لاگت
OPD بلاک	40 لاکھ روپے
آپریشن تھیٹر اور متعلقہ ضروریات	25 لاکھ روپے
زخمیوں کے لئے ایک سرجیکل وارڈ	20 لاکھ روپے
(ایک صاحب نے عطیہ دیا ہے)	
گائنی وارڈ	15 لاکھ روپے
زچہ بچہ وارڈ	15 لاکھ روپے
چلڈرن وارڈ	15 لاکھ روپے
سیڑھیاں، Rump، واٹر ٹینک، متفرق	10 لاکھ روپے

اکاؤنٹ نمبر 1128 حبیب بنک لمیٹڈ یونیورسٹی برانچ مظفر آباد

اکاؤنٹ نمبر 600 دی بنک آف پنجاب بینک روڈ مظفر آباد

میڈیکل سپرنٹنڈنٹ

کشمیر سرجیکل ہسپتال پولٹری فارم روڈ مظفر آباد آزاد کشمیر

فون: 45173 ,43700 (058810)

Email: kashmir-surgical@yahoo.com

ماہنامہ
ترجمان القرآن

جلد ۱۲۹، عدد ۸، جمادی الثانی ۱۴۲۳ھ، اگست ۲۰۰۲ء

مدیر
پروفیسر خورشید احمد

نائب مدیر
مسلم سجاد

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور
فون: ۵۴۲۵۳۵۶ (۰۴۲)
فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴ (۰۴۲)
E-mail: tarjuman@wol.net.pk

مدیر انتظامی
عبدالکریم

۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور
فون: ۷۵۸۷۹۱۶ (۰۴۲)
فیکس: ۷۵۸۵۵۹۰ (۰۴۲)
E-mail: tarjuman@pol.com.pk
www.tarjumanulquran.org

قیمت فی شمارہ: ۲۰ روپے
زرسالانہ: ۲۰۰ روپے
تاحیات: ۳۰۰۰ روپے

بنگلہ دیش، ایران، بھارت: ۶۰۰ روپے
یورپ، مشرق وسطیٰ، مشرق بعید، افریقہ: ۹۰۰ روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا: ۱۲۰۰ روپے

زیراہتمام: البلاغ ٹرسٹ

پرستارانِ باطل اور پرستارانِ حق

......جن کاموں کا ذکر کیا گیا ہے' ان سب کے لیے مالی ذرائع درکار ہیں اور یہاں ان کا فقدان ہے۔ اتنے بڑے کاموں کے لیے جس اجتماعی اعانت کی ضرورت ہوتی ہے وہ نہ ہمیں اب تک بہم پہنچی ہے' نہ آئندہ اس کی توقع ہے' نہ ہم وہ تدبیریں اختیار کر سکتے ہیں جن سے وہ بہم پہنچا کرتی ہے' اور نہ ہمیں اُن لوگوں سے کسی مدد کی اُمید رکھنے کا کوئی حق ہے جن کا مقصدِ زندگی وہ نہیں ہے جو ہمارا ہے۔ چند اہل خیر ایسے ضرور ہیں جو ہماری درخواست کے بغیر محض حسبۃً لِلّٰہ کچھ نہ کچھ بھیجتے رہتے ہیں' مگر یہ اعانت اب تک کے جماعتی کاموں کے لیے بھی ناکافی تھی کجا کہ آئندہ جو کام پیش نظر ہیں ان کے لیے یہ کچھ بھی کفایت کر سکے۔ اس وقت تک جو کچھ بھی کام ہوا ہے وہ زیادہ تر جماعت کے بک ڈپو کی آمدنی سے ہوا ہے اور وہ بھی کچھ بہت زیادہ نہیں ہے کہ اس کے بل پر کام میں اتنی توسیع ہو سکے۔

اب اس کارِ عظیم کے لیے جو ذرائع مطلوب ہیں ان کی بہم رسانی دو ہی صورتوں سے ممکن ہے۔ ایک یہ کہ جو لوگ جماعت اسلامی میں شریک ہوئے ہیں اور جو لوگ اس کے نصب العین سے ہمدردی رکھتے ہیں وہ اس راہ میں مالی قربانیاں کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں اور اُن باطل پرستوں سے سبق لیں جو آج اپنے باطل نظریات کا اقتدار قائم کرنے یا قائم رکھنے کے لیے کروڑوں پونڈ روزانہ آگ میں پھونک رہے ہیں--- ظاہر ہے کہ پرستارانِ باطل کی ان قربانیوں کے مقابلہ میں اگر پرستارانِ حق کچھ بھی قربانی نہ کریں اور اپنے ذاتی مفاد ہی کی پرستش کرتے رہیں تو قانونِ فطرت کے تحت یہ قطعی ناممکن ہے کہ ہمیں باطل کے مقابلہ میں اُس حق کو فروغ دینے میں کامیابی حاصل ہو جائے جس پر ہم ایمان لائے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہماری جماعت میں جو لوگ کسی قسم کے صنعتی یا تجارتی کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں وہ یہاں آئیں اور اپنی قابلیتوں سے کام لے کر دولت پیدا کریں اور اس کا ایک حصہ اپنی ذات پر اور دوسرا حصہ اپنے مقصدِ زندگی کی خدمت پر صرف کریں۔ (''اشارات''، ابوالاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن' جلد ۲۰' عدد ۴' ربیع الآخر ۱۳۶۱ھ' جون ۱۹۴۲ء' ص ۷-۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آئینی ترامیم: جمہوری قبا میں مستقل مارشل لا کا منصوبہ

پروفیسر خورشید احمد

جنرل پرویز مشرف کی آئینی ترامیم کی بلّی دو سال سے قومی ادارہ تعمیر نو (این بی آر) کے تھیلے میں اُچھل کود مچائے ہوئے تھی‘ اور اس پورے عرصے میں اخبارات میں رونما ہونے والی جھلکیوں (leaks) اور ارباب حکومت کے ارشادات کے ذریعے تانک جھانک کا ہنگامہ برپا رکھنے کے بعد اب‘ ۲۶ جون ۲۰۰۲ء کو بالآخر تھیلے سے باہر آ گئی ہے لیکن جو منظر سامنے آیا ہے وہ کم سے کم الفاظ میں یہ ہے کہ تھیلے سے نکلنے والی چیز نہ بلّی ہے اور نہ بلّا‘ بلکہ ایک ایسی بَلا ہے جسے اگر قابو نہ کیا گیا تو وہ جمہوری قبا میں ’’دیو استبداد‘‘ کا روپ دھار سکتی ہے۔ خطرہ اب آنکھوں کے سامنے ہے اور قوم کے لیے اس کا مقابلہ کرنے اور مقابلے کی تیاری کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

ہم نے ان ترامیم کو جنرل پرویز صاحب کی تجاویز کہا ہے اور محض جنرل تنویر یا دوسرے مشیروں کی اختراع قرار نہیں دیا خواہ ان کو اظہار کا ذریعہ بنایا گیا ہو۔ جنرل صاحب نے خود بھی ان کے دفاع کا اہتمام کیا ہے اور گذشتہ دو سال میں وہ وقتاً فوقتاً جن خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں‘ یہ اب ان کی ایک مربوط اور منظم شکل ہے۔ انھیں ان تجاویز کی ذمہ داری کھل کر قبول کرنی چاہیے اور قوم کو بھی سمجھنا چاہیے کہ جنرل صاحب کا ذہن اور منصوبہ کیا ہے؟ نیز ان کے اقتدار میں رہنے اور اقتدار کے رنگ و آہنگ کے عزائم کے بارے میں کسی شک و شبہے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ این بی آر کے دانش ور اور جنرل صاحب کے وزرائے کرام جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ جنرل صاحب ہی کی آواز بازگشت ہے۔ ان سب کا حال صرف یہ ہے کہ

انھی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں‘ زبان میری ہے بات ان کی

پوری تجویز کا جو ایک قابل قدر پہلو ہے وہ اس پر بحث و گفتگو کا تھوڑا سا موقع ہے جو لولا لنگڑا ہونے

کے باوجود بساغنیمت ہے۔ الیکٹرانک میڈیا پر حکومت اور اس کے ہم خیالوں کا اجارہ ہے، عوامی رائے کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جا رہا ہے اور مخالف رائے کے اظہار کے لیے مساوی تو کیا مناسب مواقع بھی حاصل نہیں۔ لیکن سرکاری اہتمام میں ابلاغیاتی شعبدہ بازیوں کے باوجود بحث و مذاکرے کا جو موقع میسر ہے، وہ تاریک افق پر روشنی کی ایک کرن ہے۔ اس ننھی سی کرن میں عوامی ردعمل اور سیاسی بصیرت رکھنے والوں کے اضطراب کو دیکھا جاسکتا ہے۔

اب یہ بات مسلمہ ہے کہ تمام اہم سیاسی جماعتوں اور ہر مکتب خیال کے قائدین نے ان تجاویز کی مخالفت کی ہے۔ ۹۰ فی صد اخباری تبصرے (اداریے، مضامین اور کالم) ان کے خلاف ہیں اور جن حضرات نے جزوی تائید کی ہے ان کا رویہ بھی معذرت خواہانہ اور خفت بھرا ہے۔ نیز تمام ہی بار کونسلوں نے شدید تنقید کی ہے۔ قومی ردعمل کے جائزے سے جو تصویر سامنے آئی ہے، وہ ان تجاویز سے مکمل بے زاری اور عدم اتفاق کی ہے۔ بلاشبہہ وہ چند مثبت یا قابل غور تجاویز کی نشان دہی کے ساتھ تمام ہی حلقوں نے ترامیم کے اصل اہداف اور جوہری تبدیلیوں کو قطعاً ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ یہ قوم کے اصل جذبات اور احساسات کا آئینہ ہے لیکن حکومت کا رویہ منفی اور بے اعتنائی کے ساتھ ساتھ ضد اور ہٹ دھرمی کا مظہر ہے جو ملک اور قوم کے مستقبل کے لیے اپنے اندر بڑے مہیب خطرات رکھتا ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بالکل غیر جذباتی انداز میں اصل مسائل پر دلیل کی زبان میں گفتگو کی جائے تاکہ جنرل پرویز مشرف اور ان کے ساتھیوں کے باب میں اتمام حجت ہو سکے اور پوری قوم اصل حقائق، مجوزہ ترامیم کے مضمرات اور متعلقہ دستوری، قانونی، سیاسی اور اخلاقی پہلوؤں کے بارے میں کسی لاگ لپٹ کے بغیر آگاہ ہو جائے۔ آیندہ کے معرکے کامیابی سے سر کیے جاسکیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ حق بالآخر کامیاب ہوگا اور ان شاء اللہ دلیل کی قوت ذاتی عزائم، گروہی مفادات اور بودے سہاروں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گی--- جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔

حکومت کی طرف سے ''مستحکم وفاقی جمہوریت'' (sustainable federal democracy) کے قیام کے لیے ۵۸ صفحے کی دستاویز شائع ہوئی ہے۔ اس میں دستور کی ۲۸ دفعات میں ۲۷ ترامیم کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ اس کے لیے کچھ دلائل اور جواز (rationale) فراہم کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ ہم نے اس کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے اور ان تجاویز کے حق میں جنرل پرویز اور ان کے رفقاے کار نے جو کچھ کہا ہے اس پر کھلے دل سے غور کیا ہے۔ ان تجاویز پر جو نقد و تبصرہ گذشتہ تین ہفتوں میں آیا ہے اس پر بھی کسی تعصب کے بغیر غور و فکر کیا ہے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پاکستان کی تاریخ میں نظام حکومت کی تبدیلی کے

بارے میں آج تک جو بھی تجاویز اور منصوبے آئے ہیں' یہ تجاویز سب سے زیادہ خطرناک اور دوررس نتائج کی حامل ہیں۔ یہ تجاویز جنرل ایوب اور جنرل ضیاء الحق کے دستوری تصرفات سے بھی زیادہ خطرناک' غیر متوازن' غیر حقیقی اور صرف شخصی حاکمیت اور سیاست میں فوج کو اس طرح پھنسا دینے کا ذریعہ ہیں جو ملک اور فوج دونوں کے لیے تباہ کن ہو سکتی ہیں۔ اس لیے ان کا دقت نظر سے تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ جزوی طور پر ان میں سے چند تجاویز اور مسائل کے تجزیے کے سلسلے میں چند امور ایسے بھی ہیں جن پر صحیح فورم میں غور ہو سکتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی یہ ترامیم' دستور کا حلیہ بگاڑنے' اور ملک کے سیاسی نظام کو ایک ایسا ملغوبہ بنانے پر منتج ہوں گی جو نہ جمہوری ہوگا' نہ فیڈرل اور نہ کسی دیرپا نظام کا ضامن ہو سکے گا۔ عنوان میں جو تین اہداف رکھے گئے ہیں: دیرپا' وفاقی اور جمہوری' یہ تجاویز ان تینوں کی نفی کرتی ہیں اور 'برعکس نہند نام زنگی کافور' کے مثل ہیں۔ ضرورت ہے کہ ایک ایک تجویز پر مفصل گفتگو کی جائے مگر وقت اور جگہ کی قلت اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اس لیے ہم صرف چھ مرکزی اہمیت کے پہلوؤں پر گفتگو کریں گے اور پھر حکومت اور قوم کو دعوت غوروفکر دیں گے کہ قوم اور ملک کے مفاد میں اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جائے۔

ترمیم کا اختیار

سب سے پہلا اور اہم ترین سوال یہ ہے کہ کیا جنرل پرویز مشرف کو دستور میں اس طرح ترمیم کرنے کا کوئی اختیار حاصل ہے؟ جو بھی اقدام کسی قانونی اور اخلاقی استحقاق (legal and moral authority) کے بغیر کیا جائے گا' وہ کبھی مقبول اور معتبر نہیں ہو سکتا۔ قانونی جواز ہی عوامی قبولیت اور دیرپا استحکام کی بنیاد بنتا ہے اور جو نظام قانونی اور اخلاقی جواز سے محروم ہو وہ تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوتا ہے۔

جنرل مشرف اور بی این آر نے جنرل صاحب کے اختیارات برائے ترمیم دستور کی بنیاد سپریم کورٹ کے ۱۲ مئی ۲۰۰۰ء کے فیصلے پر رکھی ہے اس لیے سب سے پہلے اس مسئلے پر بات کرنے کی ضرورت ہے۔

دستور ایک ملک کے بنیادی قانون (fundamental law) کا درجہ رکھتا ہے اور ۱۹۷۳ء کے دستور کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ قومی اتفاق رائے (national consensus) کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ بلاشبہہ وہ ایک انسانی دستاویز ہے اور اس میں تبدیلی ممکن ہے بلکہ کبھی ضروری بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کے لیے وہی طریقہ قابل قبول ہو سکتا ہے جو خود دستور میں طے کیا گیا ہے۔ اس سے ہٹ کر کوئی طریقہ معتبر نہیں ہو سکتا۔ یہ بات قابل یاددہانی ہے کہ اس دستور میں خود بھٹو کے دور میں سات ترامیم کی گئیں جن میں سے صرف ایک ترمیم (یعنی قادیانیت کے بارے میں) پر اتفاق رائے تھا اور صرف وہی ترمیم معتبر رہی۔ باقی ترامیم بھٹو

صاحب کے دور کے ساتھ ہی ختم ہوگئیں۔ جنرل ضیا الحق کی ترامیم کا معاملہ بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں۔ ان پر قومی اتفاق رائے نہیں تھا لیکن انھوں نے ۱۹۸۵ء کی مجلس شوریٰ سے اپنی ترامیم کو متفقہ طور پر منظور کرانے کے لیے ان میں ایک درجن کے قریب اہم ترامیم کیں اور اس طرح ایک نام نہاد اتفاق رائے (pseudo consensus) پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تین بنیادیں ہیں: اسلام' وفاقی نظام اور پارلیمانی جمہوریت جو پارلیمنٹ کی بالادستی' عدلیہ کی آزادی' بنیادی حقوق کی ضمانت اور انتظامیہ کی پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہی سے عبارت ہے۔ دستور نے ترمیم کا بھی ایک واضح طریق کار طے کر دیا ہے۔ دستور میں ترمیم نہ صدر کرسکتا ہے اور نہ سپریم کورٹ۔ اسی طرح چیف آف اسٹاف جس دستور کی تخلیق ہے' اس میں تبدیلی نہیں کرسکتا۔ ترمیم دستور تو اتنا نازک معاملہ ہے کہ محض ایک ایوان پارلیمنٹ بھی یہ کام نہیں کرسکتا۔ دستور نے ترمیم کا جو طریقہ رکھا ہے وہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی دوتہائی اکثریت کی رضامندی سے ترمیم ہوسکتی ہے۔ گویا اگر ایک ایوان بھی اتفاق نہ کرے تو ترمیم ممکن نہیں۔ اس کے لیے مشترک اجلاس کی گنجایش نہیں رکھی گئی ہے۔ اس پس منظر میں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ سپریم کورٹ کے مئی ۲۰۰۰ء کے فیصلے کی حقیقت کیا ہے اور اس کا جائز اور قانونی منشا کیا ہوسکتا ہے۔

اصل فیصلے پر غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ چند دوسرے حقائق بھی سامنے رہیں۔ نصرت بھٹو کے کیس میں سپریم کورٹ نے جنرل ضیاء الحق کو ترمیم دستور کا اختیار دے دیا تھا مگر جنرل صاحب نے جب عبوری دستور کا حکم نامہ (پی سی او) نافذ کیا تو اس وقت کے چیف جسٹس انوار الحق صاحب نے جو اصل فیصلے کے مصنف تھے' اسے نصرت بھٹو کیس میں دیے ہوئے اختیار سے تجاوز اور عدالت کے فیصلے سے انحراف قرار دیا اور استعفیٰ دے دیا۔ اس سے سبق لیتے ہوئے سپریم کورٹ نے مئی ۲۰۰۰ء کے فیصلے میں محدود اور مشروط اختیار کا راستہ اختیار کیا جس کے نتیجے میں آج کی صورت حال اس سے یکسر مختلف ہے جس کا سہارا ماضی میں لیا گیا۔

دوسری بات یہ بھی سامنے رہے کہ دستور میں ترمیم کے مسئلے پر بھارت اور پاکستان کی سپریم کورٹ نے دو بڑے اہم فیصلے دیے ہیں۔ بھارت میں اندرا گاندھی نے ایمرجنسی نافذ کی تو سپریم کورٹ نے طے کیا کہ پارلیمنٹ بھی دستور میں من مانی ترمیم نہیں کرسکتی۔ تدوین دستور اور ترمیم دستور دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ تدوین دستور صرف دستور ساز اسمبلی ہی کرسکتی ہے جسے عوام نے دستور سازی کا اختیار دیا ہو۔ دستور کے تحت قائم ہونے والی پارلیمنٹ دستور کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی نہیں کرسکتی۔ البتہ اس ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے اسے ترمیم کا اختیار ہے اور یہی ترمیم کا مفہوم ہے۔ گویا لفظ ''ترمیم'' کی محکم تعبیر کر دی گئی۔ یہ بڑا بنیادی فیصلہ تھا۔ اسی طرح کا فیصلہ پاکستان کی سپریم کورٹ نے اچک زئی کیس میں کیا اور یہ اصول طے کر دیا کہ

دستور کے بنیادی ڈھانچے میں ترمیم کا اختیار خود اسمبلی کو بھی نہیں۔ چہ جائیکہ کوئی فردِ واحد یہ کام کرنے کا مجاز ہو۔ سپریم کورٹ خود بھی دستور میں ترمیم نہیں کرسکتی۔ وہ صرف دستور میں ترمیم یا قانون کا عدالتی جائزہ (judical review) لے سکتی ہے۔ اس کا دائرہ تعبیر دستور ہے' ترمیم دستور نہیں۔ اس پس منظر میں' سپریم کورٹ بھی یہ اختیار نہیں رکھتی کہ کسی کو دستور میں کسی بنیادی تبدیلی کا حق دے سکے۔

اس پس منظر میں سمجھا جاسکتا ہے کہ ۱۲ مئی کے فیصلے میں سپریم کورٹ نے کیا کہا:

> ہرگاہ کہ جنرل پرویز مشرف نے ایک ماورائے دستور اقدام کے ذریعے ریاست کے مفاد میں اور عوام کی بھلائی کے لیے جائز طور پر اقتدار سنبھال لیا ہے' انھیں حق ہے کہ ایسے سب اقدامات کریں اور ایسے قانونی راستے اختیار کریں جن کا آگے بیان کیا جارہا ہے' یعنی:
>
> ۱- ایسے سب اقدامات یا قانونی راستے جو ۱۹۷۳ء کے دستور کے مطابق ہیں یا اس کے تحت کیے جاسکتے تھے بشمول اس میں ترمیم کے اختیار کے۔
>
> ۲- ایسے تمام اقدامات جو چیف ایگزیکٹو کے اعلان کردہ مقاصد کو حاصل کریں یا ان کے حصول میں مدد دیں۔

اس کے ساتھ عدالت نے واضح کردیا کہ:

> یہ کہ چیف ایگزیکٹو کی جانب سے دستوری ترامیم صرف اس صورت میں کی جاسکتی ہیں کہ دستور ان کے اعلان کردہ مقاصد کے حصول کے لیے کوئی حل فراہم کرنے سے قاصر ہو۔
>
> یہ کہ دستور کی بنیادی خصوصیات میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی' یعنی عدلیہ کی آزادی' وفاقیت' پارلیمانی طرز حکومت بشمول اسلامی دفعات۔

اس فیصلے کی جو تعبیر دستور اور دستور کے متعلق عدالتی فیصلوں کی روشنی میں کی جاسکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے چیف ایگزیکٹو کو اپنے اعلان کردہ پروگرام پر عمل کرنے کے لیے ۳ سال کی مدت دی اور ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۲ء سے پہلے نئے انتخابات منعقد کرنے کو ضروری قرار دیا۔

واضح رہے کہ چیف ایگزیکٹو کے جس ۷ نکاتی ایجنڈے پر عمل کے لیے ۳ سال کی مدت اور قانون سازی کا اختیار عدالت نے دیا وہ ان نکات پر مشتمل تھا:

۱- قومی اعتماد کی بحالی' ۲- بین الصوبائی تفاوت دُور کر کے قومی یک جہتی کی بحالی' ۳- معیشت کا احیا' ۴- امن عامہ کو یقینی بنانا اور فوری انصاف کی فراہمی' ۵- سرکاری اداروں سے سیاست کو خارج کرنا' ۶- اختیارات کی نچلی سطح تک منتقلی' ۷- احتساب۔

اگر عدالت کے فیصلے اور جنرل صاحب کے ایجنڈے کا معروضی تجزیہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ عدالت نے قانون سازی بشمول دستوری ترمیم کا اختیار ان ۳ سال کے اندر اس سات نکاتی پروگرام پر عمل درآمد کے لیے دیا تھا، مستقبل کے لیے کسی نئے دستوری ڈھانچے کی تعمیر کے لیے نہیں۔ ان ساتوں نکات کا کیا حشر ہوا؟ اسے اس وقت نظرانداز کر دیجیے (ان کے بارے میں دیکھیے: اشارات، جون ۲۰۰۲ء) اور صرف اس مسئلے پر غور کیجیے کہ ان میں سے کس کا تعلق صدر کے اختیارات، وزیراعظم کی تقرری اور معزولی، اسمبلی کی تحلیل، گورنروں کے تقرر اور قومی سلامتی کونسل کی تشکیل سے ہے۔ یہ مسائل عدالت کے زیرغور نہیں تھے۔ زیرغور صرف وہ سات نکات تھے جن پر جنرل پرویز مشرف اقتدار سنبھالنے کے بعد کچھ کر کے دکھانا چاہتے تھے، سپریم کورٹ نے قرار دیا کہ اس ایجنڈے پر کام کرنے کے لیے ان کو جن اقدامات یا قانون سازی کی ضرورت ہے وہ اسے انجام دے سکتے ہیں۔ عدالت نے لازم کیا کہ اس عمل میں ان کو ہر قدم دستور کے دائرے میں اٹھانا چاہیے اور دستور میں جو طریق کار دیا گیا ہے، اس کا مکمل احترام کرنا چاہیے۔ البتہ اگر کہیں رفع حرج (removal of difficulty) کے لیے، جو ایک معروف قانونی تصور (legal concept) ہے، کوئی ترمیم دستور میں کرنی پڑے تو کی جاسکتی ہے۔ اس کا دورانیہ بھی یہ تین سال تھے۔ اس دورانیے کے بعد کا نظام کورٹ کے فیصلے کے دائرے سے قطعاً باہر ہے۔

اپنے اس تین سالہ دور میں انھوں نے صحیح یا غلط کئی دستوری اقدام کیے جن میں صدارت کا مسئلہ بھی تھا (جو خود انھوں نے غیرفطری اور غیرضروری طور پر پیدا کیا)۔ سپریم کورٹ کے ترمیم دستور کے اختیار کا تعلق اگر ہوسکتا ہے تو صرف ان مسائل اور اس دور سے ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس میں ہرگز یہ اختیار نہیں کہ وہ آیندہ کا نیا سیاسی نظام ملک کو دیں- یہ نہ ان کے اصل ایجنڈے کا حصہ ہے، نہ سپریم کورٹ کے فیصلے میں اس دائرہ کار کا کوئی ذکر ہے، اور نہ کسی بھی دلیل کے ذریعے اسے ان کی ذمہ داری قرار دیا جا سکتا ہے- جو ترامیم وہ اب لا رہے ہیں ان کا کوئی تعلق اس ایجنڈے سے نہیں۔ بلکہ واضح طور پر وہ ان تمام حدود اور پابندیوں کو پامال کرنے کا باعث ہوں گی جو سپریم کورٹ نے صاف لفظوں میں عائد کی تھیں--- یعنی پارلیمانی نظام اور وفاقیت اصول کی حفاظت- دستوری ترامیم کی جو تجاویز اس وقت پیش کی جا رہی ہیں ان کے لیے سپریم کورٹ کی محدود اور مقید اجازت کا سہارا ایک ایسی جسارت ہے جسے شیطان کے آیتیں پڑھنے (devil quoting scripture) کی بدترین مثال ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

دستور میں ترمیم دستور کے دیے ہوئے طریقے کے مطابق ہی ہوسکتی ہے۔ جنرل صاحب کے لیے

ایک ہی معقول راستہ ہے اور وہ یہ کہ الیکشن کے بعد دستوری ترمیم کے مسئلے کو پارلیمنٹ میں زیر بحث لانے کی دعوت دیں اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوان ان پر کھلی بحث کے ذریعے میرٹ کی بنیاد پر غور کریں۔ کسی فرد واحد کو یہ اختیار نہیں کہ دستور کی من مانے انداز میں بیخ کنی کرے یا قوم کے متفقہ دستور پر اپنے زعم میں جو نیا ڈھانچہ چاہے مسلط کر کے اس کا حلیہ بگاڑ دے۔ افسوس کہ جنرل پرویز نے اپنے پیش رو فوجی حکمرانوں اور طالع آزماؤں کی اسی نوعیت کی کوششوں اور ان کے انجام سے بھی کوئی سبق نہ سیکھا۔ جنرل ایوب نے ایک فرد واحد کی حیثیت سے ۱۹۶۲ء کا دستور بنایا اور وہ دستور ان کے اقتدار کے سورج کے غروب ہونے کے ساتھ ہی لقمہ اجل بن گیا بلکہ ان کے اپنے ہاتھوں اس کا جھٹکا ہوا۔ جب انھوں نے اس دستور کے تحت اقتدار' اسمبلی کے اسپیکر کی طرف منتقل کرنے کے بجائے اس وقت کے فوج کے سربراہ جنرل یحییٰ کو منتقل کیا۔ جنرل یحییٰ نے جو دستور بنایا' وہ ان کے رخصت ہونے کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ جنرل ضیاء الحق کو اسمبلی اور سینیٹ سے سمجھوتہ کر کے اپنی ترمیمات منوانا پڑیں اور پھر بھی ان کو وہ تقدس اور احترام حاصل نہ ہو سکا جو دستور کا حق ہے۔ جنرل پرویز بھی اسی ناکام راستے پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ایک ''کمانڈو صدر'' کا کردار ادا کرنے کی جسارت کر رہے ہیں لیکن اس کا انجام بھی دوسروں سے مختلف نہیں ہو سکتا۔

اخلاقی حیثیت

دوسرا بنیادی مسئلہ جنرل صاحب کی ذات اور اخلاقی استحقاق کا ہے۔ انھیں اپنی حیثیت کو نہیں بھولنا چاہیے۔ وہ لاکھ لوگوں کو یقین دلائیں کہ وہ ''اب بھی ۱۹۹۹ء والے جنرل مشرف ہی ہیں'' لیکن ان تین برسوں میں ان کی شخصیت بری طرح مجروح ہوئی ہے۔ اب قوم ان کو ان کے تین سالہ ریکارڈ کی روشنی میں دیکھ رہی ہے۔ ان کے سات نکات میں سے ایک بھی مثبت نتائج کا حامل نہیں ہو سکا۔ قومی وقار بلکہ ملک کی آزادی اور خودمختاری کی جو پامالی اس دور میں ہوئی ہے وہ شرم ناک ہے۔ جس طرح ہم امریکہ کے عالمی استعماری عزائم کا آلہ کار بنے ہیں اور جس طرح امریکہ نے ہمیں استعمال کیا ہے اور بھارت کے ساتھ اسٹرے ٹیجک شراکت کا تانا بانا بُنا ہے اس نے ملک کو نئے اندرونی اور بیرونی خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ جو دوست تھے وہ دشمن بن گئے ہیں' جو مخالف تھے وہ سر چڑھ رہے ہیں اور جو نفرت امریکہ کا مقدر تھی اس کا ایک حصہ اب ہمارے حصے میں بھی آ گیا ہے۔ بلکہ اگر امریکی روزنامہ وال اسٹریٹ جرنل کے ایک تازہ جائزے پر یقین کیا جائے تو خود جنرل صاحب کی امریکہ کے لیے افادیت کی مدت اکتوبر ۲۰۰۲ء تک رہ گئی ہے۔ کینیڈا کے روزنامہ دی گلوب اینڈ میل میں پال ناکس نے تو دسمبر ۲۰۰۱ء (شمارہ ۱۰ دسمبر ۲۰۰۱ء) ہی میں پیشین گوئی کر دی تھی:

اب جب کہ جنگ کے آخری مراحل ہیں' جنرل مشرف سیاسی شطرنج کے کھیل کے اختتام پر نقصان

میں ہیں۔

اس نے مبصرین کی یہ رائے بھی نقل کی تھی کہ:

ہم بین الاقوامی سطح پر بنیادی طور پر تعلقات کی نئی ترتیب تشکیل پانے کی تصویر دیکھ رہے ہیں۔ امریکہ' بھارت' اسرائیل اور روس کئی مسائل پر بظاہر قریب آتے نظر آ رہے ہیں لیکن پاکستان کو بے آسرا چھوڑ دیا گیا ہے۔

امریکی جریدے نیوز ویک (۱۵ جولائی ۲۰۰۲ء) نے پاکستان کے حالات کی جو منظرکشی کی ہے وہ جنرل صاحب کی تین سالہ کارکردگی کی عکاس ہے:

بہت سے پاکستانی فوج میں اس لیے شامل ہوئے کہ اپنے ملک کا بھارت کے خلاف دفاع کریں گے۔ وہ اس کے لیے لڑنے اور جان دینے کے لیے تیار اور راضی ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت سوں کے لیے مسئلہ یہ ہے کہ وہ غلط دشمن سے لڑ رہے ہیں۔ (ص ۱۸)

انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون نے اپنی ۶ جولائی کی اشاعت میں نیویارک ٹائمز کا اداریہ دیا ہے جس میں ایک طرف اس بات کا اعتراف ہے کہ جنرل مشرف اب بھی نام نہاد ''تشدد کے خلاف جنگ'' میں امریکہ کی ضرورت ہیں۔ نیز اس لیے بھی امریکہ کے لیے مفید ہیں کہ وہ ''مغرب نواز اور سیکولر نظام حکمرانی کے علم بردار'' ہیں لیکن ساتھ ہی کشمیر کے سلسلے میں ان کے کردار کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس زمینی صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ ریفرنڈم کی حماقت کر کے انھوں نے اپنی پوزیشن کمزور کر لی ہے اور جمہوری اداروں کی نکیل بندی کے لیے جو دستوری ترامیم وہ لا رہے ہیں اس سے ان کی عوامی مقبولیت کو دھچکا لگے گا اور ملک میں ان سے مایوسی پیدا ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک اور ملک سے باہر جنرل پرویز مشرف کی پوزیشن روز بروز خراب ہو رہی ہے۔ آج کسی کی نظر میں بھی ان کی عزت نہیں ہے' اور پاکستان کے ساتھ بھی وقار اور عزت کا معاملہ نہیں کیا جا رہا جس کی تازہ ترین مثال وہ جھاڑ ہے جو امریکہ کے نائب وزیر خارجہ آرمی ٹیج نے سرحد پار دراندازی روکنے کے لیے وعدے مکمل طور پر پورے نہ کرنے پر جنرل صاحب اور ان کے نمایندوں کو پلائی ہے۔ آج بھارت کو تو اس کے ریاستی تشدد پر کوئی کچھ نہیں کہہ رہا اور سارا دباؤ پاکستان پر ہے کہ جہاد کشمیر کی ہر قسم کی اعانت سے دست کش ہو جائے۔ اس صورت حال کا موازنہ اگر ۱۰ سال پہلے کے حالات سے بھی کیا جائے تو فرق واضح ہو جاتا ہے۔ بھارت کے ایک سابق کیبنٹ سیکرٹری وی بالا چندرن نے ۱۰ جولائی ۲۰۰۲ء کے دی ایشین ایج میں اپنی جو یادداشتیں شائع کی ہیں وہ پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہیں۔ وہ ۱۴ دسمبر ۱۹۹۲ء کو واشنگٹن میں اس وقت کے سی آئی اے کے ڈائرکٹر روبرٹ گیٹس سے ان کے دفتر میں ملاقات میں

پاکستان کے خلاف اسی سرحد پار دراندازی کے بارے میں اپنی شکایت کا ذکر کرتے ہیں اور روبرٹ گیٹس کے ردعمل کو بیان کرتے ہیں:

ہمیں امید تھی کہ وہ پاکستان کی پشت پناہی سے ہونے والی دہشت گردی پر تشویش کا اظہار کریں گے اس لیے کہ وہ برعظیم میں ہونے والے واقعات سے قریب سے واقف رہے تھے۔ مگر ہم تعجب میں رہ گئے جب انھوں نے ہمارے لیڈروں کو ایک واعظانہ ڈانٹ پلائی: ''مسٹر سیکرٹری' ہم نے آپ کی باتوں کو نوٹ کیا ہے لیکن ہم پاکستان سے آپ کے خلاف ایسی ہی شکایتیں سن رہے ہیں اور ہم پسند کریں گے کہ ایسی شکایتیں آیندہ نہ سنیں''۔ (دی ایشین ایج' لندن' ۱۰ جولائی ۲۰۰۲ء)

یہ تھا امریکہ کا رویہ ۱۰ سال پہلے' اور آج جنرل صاحب کی امریکہ کی ساری ناز برداری کے باوجود' کیا ہے ہماری عزت اور وقعت! ہوسکتا ہے کہ جنرل صاحب ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۰ء میں ایک ہی ہوں لیکن پاکستان کا حال تو ایک سا نہیں رہا۔

کسی بھی فرد واحد کو دستور میں ترمیم کا اختیار نہیں۔ قائداعظم کی تقلید کی باتیں تو ہم بہت کرتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ قائداعظم جن کی قیادت میں ملت اسلامیہ ہند نے پاکستان قائم کیا اور ان کو بے تاج ہی نہیں تاجدار ''بادشاہ'' کا مقام دیا' انھوں نے بھی ایک بار نہیں بار بار کہا کہ پاکستان کا دستور بنانے کا کسی فرد کو اختیار نہیں۔ یہ صرف دستور ساز اسمبلی کا استحقاق ہے اور وہی یہ کام انجام دے سکتی ہے۔ (ملاحظہ ہو' ان کی تقریر سبی دربار بلوچستان' ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء۔ خطاب سول افسران سبی' ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء۔ خطاب عوام ریاست ہاے متحدہ امریکہ' فروری ۱۹۴۸ء (Jinnah: Speeches and Statements, 1947-48 آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس' ص ۱۰۸-۱۱۲-۱۲۵)

سوال یہ ہے کہ جو اختیار قائداعظم نے اپنے لیے بھی صحیح نہ سمجھا' جنرل پرویز صاحب کس دستوری' قانونی' سیاسی اور اخلاقی بنیاد پر ہم سے یہ اختیار مانگ رہے ہیں اور صرف اختیار ہی نہیں مانگ رہے بلکہ دستور کی جامہ تراشی اس طرح کرنا چاہتے ہیں کہ وہ صرف ان کے قدوقامت کی تزئین کا سامان بن جائے۔

آئینی ترامیم کے بارے میں ہمارا پہلا اعتراض دستوری اور اصولی ہے لیکن اب اس بارے میں بھی کوئی اشتباہ باقی نہیں کہ جنرل پرویز صاحب جس راستے پر چل نکلے ہیں وہ ذاتی اقتدار کا استحکام اور فوج کے شانوں پر سوار ہوکر شخصی حاکمیت کا قیام کے سوا کچھ نہیں۔ پہلے وہ یہ دعوے کرتے تھے کہ ''میرا کوئی شخصی ایجنڈا نہیں'' لیکن ان ترامیم نے ثابت کردیا ہے کہ ان کا ہدف اداروں کا استحکام نہیں بلکہ ایک فرد کے ہاتھوں میں

اقتدار اور سیاسی قوت کو محصور کرنا اور اسے اصل اختیارات کا مرکز بنانا ہے خواہ اس سے دستور کی صورت کتنی ہی قبیح کیوں نہ ہو جائے اور ملک کیسے ہی خطرات سے دوچار ہو جائے۔ اس کے لیے عدالت اور فوج دونوں کو استعمال کیا جا رہا ہے اور انتظامیہ اور نئی سول حکومت کا جو نظام بنایا گیا ہے اسے بھی اس مقصد کے حصول کے لیے جھونک دیا گیا ہے۔

اس سلسلے کا آغاز صدارت پر شب خون مارنے سے ہوا۔ پھر ریفرنڈم کا ڈراما رچایا گیا اور اب آئینی ترامیم کے ذریعے ایک ایسا سیاسی نظام ملک پر مسلط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس سے ملک میں نہ معروف معنی میں پارلیمانی نظام باقی رہے گا اور نہ معروف تصور کے مطابق کوئی صدارتی نظام ہی وجود میں آسکے گا بلکہ ایک ایسا مخلوط نظام (hybrid system) ہمارا مقدر ہوگا جس کو غالباً militio presidentism کہا جائے تو نادرست نہ ہوگا۔ ان ترامیم کا لازمی تقاضا ہے کہ قوت کا سرچشمہ صدر کی ذات بن جائے اور اصرار ہے کہ وہ صدر چیف آف اسٹاف بھی ہوگا۔ اس صدر کو صرف اسمبلی توڑنے ہی کا مکمل اختیار حاصل نہیں ہوگا بلکہ وزیراعظم نامزد کرنے، صرف وزیراعظم یا اس کی کابینہ کو برطرف کرنے، وزیراعظم کی طرف سے اسمبلی کی تحلیل کے مشورے کو اسمبلی کو واپس بھیجنے کا اختیار بھی ہوگا۔ اسی طرح اسے تمام صوبوں کے گورنر مقرر کرنے کا اختیار ہوگا اور یہ گورنر صدر کی طرح چیف منسٹر بنانے اور ہٹانے اور صوبائی اسمبلی تحلیل کرنے کا اختیار رکھیں گے جو وہ صدر کے مشورے سے انجام دیں گے۔ اس صدر کو تمام اہم تقرریاں کرنے کا بھی کلی اختیار ہوگا یعنی چیف الیکشن کمیشن، چیئرمین پبلک سروس کمیشن، بری، بحری اور ہوائی افواج کے سربراہ، جوائنٹ چیف آف اسٹاف کا سربراہ، نیب کا سربراہ۔ صدر قومی سلامتی کونسل کا سربراہ بھی ہوگا اور اس میں فوج کے تمام سربراہ موجود ہوں گے۔

سیاسی جماعتوں کے لیے تو پابندی ہے کہ ان کے سربراہ اور نمایندے جماعت اور حکومت دونوں کے بیک وقت عہدہ دار نہیں ہو سکتے لیکن فوج کے سربراہ کے لیے کوئی پابندی نہیں کہ صدر ہوتے ہوئے وہ فوج کا سربراہ نہیں ہوسکتا۔ دستور کی خلاف ورزی پر وزیراعظم کو تو برطرف کیا جاسکتا ہے مگر دستور کی خلاف ورزی صدر اور چیف آف اسٹاف کے لیے معاف ہے۔ دستور کی یہ شق کہ کوئی حاضر سروس سرکاری ملازم اسمبلی کا رکن نہیں بن سکتا چیف آف اسٹاف کے لیے ساقط ہو جائے گی۔ توازن اور چیک اینڈ بیلنس کی بات ہوتی ہے لیکن یہ کیسا توازن ہے کہ صدر چیف آف اسٹاف بھی ہو اور تمام صوابدیدی اختیارات سے مسلح ہو۔ وہ ایک پلڑے میں ہے اور دوسرے میں منتخب پارلیمنٹ جو صدر ہی کے رحم و کرم پر ہے۔ اگر توازن اسی کا نام ہے تو پھر الفاظ و معنی میں ربط کی بات کرنا پاگل پن ہی ہوسکتا ہے۔ وزیراعظم کے لیے تو شرط ہے اور بجا طور پر ہے کہ اگر اس

کے خلاف مواخذے کی قرارداد آ جائے تو وہ اسمبلی کو تحلیل کرنے کی سفارش نہیں کر سکتا لیکن صدر کے خلاف اگر مواخذے کی قرارداد آ جائے تو وہ اس کے بعد بھی اسمبلی کو تحلیل کر سکتا ہے۔ اس کے لیے کوئی چیک نہیں ہے۔ یہ کیسا چیک اینڈ بیلنس ہے؟ کسی ایک فرد کو سیاسی نظام کا اس طرح محور بنا دینا دراصل ایک قسم کی بادشاہت قائم کرنے کی کوشش ہے جو تاریخ کے دھارے کو موڑنے کے مترادف ہے۔ امریکہ کی نارٹے ڈام یونی ورسٹی کا پروفیسر رابرٹ جوہانسن اپنے ایک مقالے Military Policies and the State System as Impediments to Democracy" میں بڑے پتے کی بات لکھتا ہے جسے جنرل صاحب اور ان کے ہم خیالوں کو بھی سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے:

> کسی فرد کو خواہ وہ کتنا ہی عقل مند، کتنا ہی نیک اور کتنا ہی مقبول کیوں نہ ہو، کبھی بھی اس کے ہاتھ میں ایسے فیصلے کرنے کا اختیار نہیں دیا جا سکتا جو انسانی تاریخ میں بے حد اہم اور ناقابل تلافی ہوں۔ اس طرح کے اختیارات کسی جمہوریت میں جائز نہیں سمجھے جاسکتے۔ (بحوالہ Prospects for Democracy، تدوین: ڈیوڈ ہیلڈ، اسٹینفورڈ یونی ورسٹی پریس، کیلی فورنیا، ۱۹۹۳ء، ص ۲۲۶)

ملک میں استحکام اداروں کی مضبوطی سے آتا ہے، محض افراد کو مرکز اقتدار بنانے سے نہیں۔ جو قانون اور ضابطہ اصول اور حق پر مبنی نہ ہو اور جسے محض افراد کی خواہشات کی مناسبت سے وضع کیا ہو، وہ ترقی کی راہ کی رکاوٹ تو بن سکتا ہے اس کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ جنرل صاحب نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ ملک و قوم کے مفاد سے متصادم ہے اور خود ان کے لیے بھی خیر کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ فی الحقیقت اس ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو ہوش کے ناخن لیں، تاریخ سے سبق سیکھیں اور اداروں کی تباہی سے باز رہیں۔ جس سمت میں وہ چل پڑے ہیں وہ جمہوریت کی سمت نہیں۔ شخصی حکومت اور مطلق العنانیت کا راستہ ہے اور اسے یہ قوم ہرگز قبول نہیں کرے گی۔ جنرل ایوب، جنرل یحییٰ، ذوالفقار علی بھٹو، جنرل ضیاء الحق اور نواز شریف جس نے بھی اپنے اپنے انداز میں شخصی حکومت اور آمریت (خواہ سول ہو یا خاکی، منتخب ہو یا غیر منتخب) کا راستہ اختیار کیا، اس نے ملک و قوم کو نقصان پہنچایا اور وہ خود بھی ناکام و نامراد رہا۔ عقل مند وہ ہے جو دوسروں سے عبرت پکڑے اور وہ غلطیاں نہ دہرائے جو دوسروں نے کیں اور جو قوم کے لیے خرابی اور خود ان کے لیے نامرادی کا باعث بنیں۔

فوج کا کردار

مجوزہ آئینی ترامیم کا تیسرا بڑا اہم پہلو سیاست میں فوج کو مستقل طور پر ملوث کر دینا ہے۔ گویا اس کا ایک مستقل کردار وضع کرنے کی کوشش ہے۔ جنرل تنویر نقوی نے بہت صاف لفظوں میں اس امر کا اظہار کر دیا

ہے کہ "ملکی سیاست میں فوج کا غیر تحریری' غیر واضح اور غیر رسمی کردار رہا ہے' اب اسے باضابطہ کر دیا گیا ہے۔ یہ مستقبل کے لیے مارشل لا کا راستہ روکنے کی تدبیر نہیں ملک کو مستقلاً مارشل کے زیر سایہ رکھنے کا منصوبہ ہے۔ اس کی شکل یہ ہے کہ جنرل پرویز کی ذات میں صدارت اور چیف آف آرمی اسٹاف کی دونوں حیثیتیں جمع کر دی گئی ہیں اور ان کو کم از کم پانچ سال تک جمع رکھا جائے گا۔ جنرل پرویز نے بی بی سی کو ایک انٹرویو میں صاف لفظوں میں بتایا ہے کہ "میں یہ دونوں عہدے ساتھ ساتھ رکھوں گا"۔ اس کے ساتھ ایک مستقل ادارہ جو غیر منتخب ہے' قومی سلامتی کونسل کی شکل میں بنایا جا رہا ہے جس کا سربراہ صدر ہوگا اور جس میں تینوں افواج کے سربراہ اور جوائنٹ چیف آف اسٹاف کا سربراہ رکن ہوں گے۔ ان کے علاوہ وزیراعظم اور چاروں وزرائے اعلیٰ اس میں ہوں گے اور اب تجویز ہے کہ قائد حزب اختلاف بھی اس میں ہوگا۔ اس کونسل کے سلسلے میں امریکہ کی قومی سلامتی کونسل کا حوالہ بھی دیا گیا ہے اور ماقبل کی کوششوں سے موازنہ کر کے اس کی ضرورت اور افادیت بیان کی گئی ہے۔

ہماری نگاہ میں یہ ایک نہایت خطرناک تجویز ہے جسے چند در چند مغالطوں کے ذریعے قابل قبول بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ان تضادات کو بھی نظرانداز کیا جا رہا ہے جو خود اس تجویز میں مضمر ہیں۔ جس وجہ سے یہ تجویز کسی بھی شکل میں ہماری نگاہ میں قابل قبول نہیں وہ یہ تصور ہے کہ طاقت کے تین مرکز ہیں: صدر' وزیراعظم اور فوج اور ان کے درمیان اشتراک اقتدار ہونا چاہیے۔ پھر اشتراک اقتدار کے لیے بھی یہ "اصول محکم" بطور بنیاد بیان کیا گیا ہے کہ وحدت اقتدار (unity of command) ضروری ہے اس کے بغیر جوتیوں میں دال بٹے گی۔ پھر اس وحدت کی ٹوپی صدر کے سر پر رکھی گئی ہے اس لیے کہ وہ چیف آف اسٹاف بھی ہے۔ کل ایسا صدر بھی ہو سکتا ہے جو چیف آف اسٹاف نہ ہو تو پھر اس وحدت اقتدار کا کیا بنے گا؟ کیا پھر وہ کش مکش شروع نہ ہو جائے گی؟ یا ہمیشہ کے لیے ضروری ہوگا کہ چیف آف اسٹاف ہی صدر بنے؟ اور کیا آیندہ کے چیف آف اسٹاف اس پر قانع ہو جائیں گے کہ وہ صرف چیف آف اسٹاف رہیں اور صدر کوئی دوسرا ہو۔ قانون کے مطابق چیف آف اسٹاف کے لیے ایک متعین مدت ہے اور فوج کی تینوں شاخوں کے سربراہوں کے لیے ایک ہی مدت ہے۔ لیکن بری فوج کے چیف آف اسٹاف کا معاملہ مختلف کر دیا گیا ہے جو دوسری افواج میں بددلی پیدا کرنے کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ صدر کے لیے بطور چیف آف اسٹاف خود اپنی مدت ملازمت بڑھانے کا راستہ کھلا ہوا ہے جب کہ باقی سب کے لیے مدت کی تحدید ہے' بشمول وزیراعظم اور وزیراعلیٰ۔ ان تمام تضادات کی کوئی توجیہ نہیں کی گئی۔ قومی سلامتی کونسل کے جواز میں یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ مشاورتی ادارہ ہے لیکن مشاورتی ادارہ صدر کے لیے ہے جو کم از کم دستوری طور پر اور خود جنرل پرویز کے اعلانات کے مطابق

قوت نافذہ رکھنے والا صدر (executive president) نہیں ہے۔ حالانکہ مشورہ دینے والا ادارہ یا ایگزیکٹو سربراہ کے لیے ہوتا ہے یا ادارہ خود ایگزیکٹو ہوتا ہے۔ لیکن جس نوعیت کی کونسل یہاں بنائی جارہی ہے اس کے وظائف اور اس کے جواز کے دلائل میں کوئی نسبت نہیں۔

سب سے بنیادی اور مرکزی سوال ملک کے سیاسی نظام میں فوج کے رول کا ہے۔ جو لوگ زمینی حقائق کی بات کرتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ بھی ایک زمینی حقیقت ہے کہ فوجی حکمرانی کے چاروں ادوار میں فوج کی سیاسی میدان میں کارکردگی بھی اتنی ہی ناکام رہی ہے جتنی نام نہاد جمہوری سول حکومتوں کی۔ بلکہ ملک کی سلامتی اور وحدت کو زیادہ نقصان فوج کی حکمرانی کے ادوار میں ہوا ہے۔ یہی جدید تاریخ کا فیصلہ ہے کہ دنیا میں جہاں بھی فوجی حکومتیں قائم ہوئی ہیں وہاں فوج کی پیشہ ورانہ صلاحیت بھی تباہ ہوئی ہے اور ملک کے سیاسی اور معاشی مسائل بھی اصلاح سے محروم اور خرابیوں کی آماجگاہ بن گئے ہیں۔

فوجی حکومتوں کے لانے اور باقی رکھنے میں بیرونی طاقتوں کا بھی ہاتھ رہا ہے اور جہاں بیرونی ہاتھ نہ بھی ہو وہاں بھی فوجی حکمران اپنی تربیت' صلاحیت' مزاج' عزائم ہر اعتبار سے سیاسی قیادت فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ چلی' برازیل' ارجنٹائن' گوئٹے مالے' برما' انڈونیشیا' مصر' شام' یوگنڈا' ترکی' کانگو' نائیجیریا' گھانا' یونان' غرض دنیا کے کسی بھی گوشے میں دیکھ لیا جائے سیاست میں فوج کی مداخلت ملک اور فوج دونوں کے لیے تباہ کن رہی ہے۔ بڑے محکم شواہد اور دلائل کی بنیاد پر دنیا اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ فوج کا کردار دفاع وطن ہے اور اسی میدان میں رہ کر وہ اپنی قابلیت اور صلاحیت کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ سیاست میں آکر اس کا پیشہ ورانہ کردار مجروح ہوتا ہے اور وہ پوری قوم کی فوج نہیں رہتی۔ اس کا سیاسی کردار اسے متنازع بنا دیتا ہے اور قوم اور فوج میں کش مکش کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

فوج کی ذہنی ساخت (mindset) سول نظام کے تقاضوں سے ناآشنا اور اس کے لیے ناموزوں ہے۔ فوج جب سیاست میں داخل ہوتی ہے تو وہ یہاں بھی اسی مزاج کا مظاہرہ کرتی ہے جو فوج کے اپنے دائرے میں تو مناسب بلکہ ضروری ہے مگر عوامی اور سیاسی میدان کے لیے قطعاً ناموزوں ہے۔ اس سے تصادم بھی جنم لیتا ہے اور مسائل بھی اُلجھتے اور گھمبیر شکل اختیار کرتے ہیں جو بالآخر جبر و تشدد اور جمہوریت اور حقوق انسانی کی پامالی پر منتج ہوتے ہیں۔

ہمارے جنرل صاحب بھی وحدتِ اقتدار کی بات کرتے ہیں جو فوج کے ذہن کا فطری حصہ ہے لیکن جمہوریت نام ہے مختلف عناصر اور تصورات میں توافق اور تعاون کا۔ اختلاف ہی جمہوریت میں اتحاد کی راہیں نکالتا ہے جب کہ فوج میں اصل چیز اجتماعیت' نظم اور اطاعت ہے۔ انفرادیت جو جمہوریت کی بنیاد ہے وہ فوج

کی مطابقت (conformism) کی ضد ہے۔ یہی وہ بات ہے جو فوجی ذہن کو سیاست کے لیے غیر موزوں بنا دیتی ہے۔ جو چیز ایک نظام کی روح اور اس کی تقویت کا باعث ہے وہی دوسرے نظام کے لیے سخت ناموزوں اور فساد کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس سلسلے میں درجنوں تحقیقی کتب اور مقالات خصوصیت سے گذشتہ ۵۰ سال کے تجربات کی روشنی میں شائع ہوئے ہیں۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جب تک فوج سول نظم کے تابع نہ ہو کوئی مستحکم جمہوری نظام وجود میں نہیں آسکتا۔ اگر فوج کو سول کنٹرول میں دے دیا جائے یا سول اور فوج کو دو مساوی مراکز اقتدار قرار دے کر ان میں اشتراک کا کوئی نظام تجویز کیا جائے تو وہ ملک اور فوج دونوں کے لیے بالآخر تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ عقلی دلائل اور تاریخی شواہد دونوں اس حقیقت کی تائید کرتے ہیں۔

ریاست کے وجود' حکومت کی کامیابی' قومی سلامتی اور عوامی فلاح و بہبود اور بالآخر امن' خوش حالی اور ترقی کے حصول کے لیے جہاں جائز اور مبنی برحق (legitimate) اداروں اور قیادتوں کا وجود ضروری ہے' وہیں وہ قوت قاہرہ (coercive power) بھی درکار ہے جو ان مقاصد کے حصول کے لیے ناگزیر ذریعہ ہے۔ اس کے لیے پولیس (ملکی امن و امان) اور فوج (بیرونی خطرات سے تحفظ اور دفاع) ضروری ادارے ہیں اور ایک جان دار' متوازن اور مستحکم ریاست کے قیام کے لیے فوج کا وجود اور اس کی حقیقی ضرورتوں کی فراہمی ضروری ہے۔ دو چیزوں میں فرق کرنا لازم ہے--- ایک' فوج کی حقیقی ضرورتوں اور قومی سلامتی اور حکمت عملی کے بارے میں اس کے تجزیوں اور تجاویز پر غور' نیز عالمی حالات اور درپیش خطرات کے ادراک کے باب میں افہام و تفہیم۔ یہ ہر ریاست کی ضرورت ہے اور اس کا معقول انتظام ہونا چاہیے۔ دوسرے' فوج کا اختیار اور اجتماعی' خصوصیت سے' سول معاملات میں اس کا کردار ہے۔ پہلی ضرورت ہر ملک اور قوم کو بطریق احسن پوری کرنی چاہیے اور اس کے لیے مناسب ادارے ہونے چاہییں۔ اصل بحث دوسرے مسئلے کے بارے میں ہے اور اس میں صحیح راستہ ایک اور صرف ایک ہے' اور وہ یہ کہ فوج کو سول نظام کے تابع ہونا چاہیے۔ جہاں بھی فوج سول نظام کی گرفت سے باہر ہوئی ہے یا اس پر قابض یا شریک اقتدار ہوئی ہے اس سے خرابی رونما ہوئی ہے۔ مجوزہ آئینی ترامیم میں جو چیز قابل اعتراض اور سخت خطرات کی حامل ہے وہ یہی دوسری چیز ہے۔

پاکستان کے دستور نے فوج کے کردار کو صاف لفظوں میں متعین کر دیا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی ملک اور فوج دونوں کے لیے سخت نقصان دہ ہوگی اور ایک نہ ختم ہونے والی کش مکش کو جنم دے گی جو ملک کی سلامتی کے لیے خطرہ ہے۔

دستور کی دفعہ ۲۴۳ فوج کے قیام' مرکزی حکومت کے اس پر کنٹرول' صدر مملکت کی سپریم کمانڈ اور اہم

عہدوں کے تقرر کے بارے میں ہے۔ دفعہ ۲۴۴ حلف کے سلسلے میں ہے جس میں سیاست سے مکمل احتراز کا عہد ہے۔ دفعہ ۲۴۵ سب سے اہم ہے' جس میں کہا گیا ہے کہ:

> مسلح افواج وفاقی حکومت کی ہدایات کے تحت بیرونی جارحیت یا جنگ کے خطرے کے خلاف پاکستان کا دفاع کریں گی یا قانون کے تابع شہری احکام کی امداد میں جب ایسا کرنے کے لیے طلب کی جائیں' کام کریں گی۔

پھر دفعہ ۶ اس باب میں بہت واضح ہے۔ اس میں دستور کو منسوخ کرنے' منسوخ کرنے کی کوشش کرنے یا اسے غیر موثر بنانے اور کسی صورت میں اس کی تخریب کرنے یا تخریب کرنے کی کوشش کرنے کو بدترین غداری (high treason) قرار دیا گیا ہے۔

اس طرح دستور نے فوج پر سول کنٹرول کے اصول کو محکم انداز میں پاکستان کی ریاستی پالیسی کے طور پر طے کر دیا ہے اور فوج یا سول سروس سے متعلق افراد کو ملازمت ختم ہونے کے دو سال بعد عام سیاسی راستے سے سیاست میں شرکت کی اجازت دی ہے۔ اس سے ہٹ کر کسی شکل میں اس کی اجازت نہیں دی۔

انسانی تاریخ کے دو سو سالہ تجربات کا حاصل بھی یہی ہے۔ اس لیے کہ جہاں فوج کا وجود ضروری ہے اور جہاں اس کی ضرورتوں کو پورا کرنا اور اس کے تجزیے اور حالات کے جائزے سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے وہاں ریاست اور معاشرے کے معاملات طے کرنے اور خصوصیت سے جمہوری نظام کے فریم ورک میں یہ ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے جن صلاحیتوں' جن تجربات اور جن طریقوں کی ضرورت ہے وہ فوج اور اس کے نظام کار سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ فوج' قومی سلامتی کے ایک پہلو: دفاع یعنی' جنگ اور بیرونی عسکری مداخلت کے مقابلے کی تربیت پاتی ہے اور اس کے افراد کی نفسیات سے لے کر اس کے پورے نظام کار تک اصل محور صرف یہی ہدف رہتا ہے جب کہ سیاسی نظام' اور خصوصیت سے جمہوری نظام میں' قومی سلامتی کا تعلق عسکری پہلو کے ساتھ معاشی' معاشرتی' سیاسی' اخلاقی اور تہذیبی پہلوؤں سے بھی ہوتا ہے۔ سیاسی اور جمہوری نظام کے پیش نظر صرف ریاست اور حکومت ہی نہیں بلکہ پورے معاشرے اور افرادِ معاشرہ کی سلامتی اور فلاح و بہبود ہوتی ہے۔ یہ ایک بالکل دوسرا ہی تصور ہے' جس کے لیے بالکل دوسری قسم کی ذہنیت' تربیت اور نظام کار درکار ہے۔

دوسری جنگ کے بعد آزادی کی تحریکوں کے نتیجے میں ڈیڑھ سو سے زیادہ نئے ملک وجود میں آئے اور ان میں مختلف سیاسی نظاموں کے تجربات ہوئے جن میں فوجی حکومتوں کے قیام اور فوج کے مستقل سیاسی کردار کی مختلف شکلوں کا تجربہ ہوا' نیز مغربی استعمار اور اشتراکی تحریک دونوں نے اس بارے میں اپنا اپنا کردار ادا کیا' اس لیے گذشتہ پچاس برسوں میں اس موضوع پر کثیر لٹریچر وجود میں آیا ہے اور بالآخر اس پر اہل علم کا اجماع سا

ہوگیا کہ فوج کے لیے اصل کردار فوجی ہے' سول حکمرانی کا نہیں۔ وہی فوج بہتر اور وہی معاشرہ جمہوری اور فلاحی مقاصد کو حاصل کر سکے گا جس میں فوج سول کنٹرول میں ہو۔ اس سلسلے میں ہارورڈ کے مشہور سیاسی مفکر سیموئیل ہن ٹنگٹن کی کتاب The Soldier and the State: The Theory and Practice of Civil Military Relations, Berkeley University Press, 1957 اور بی رونیلٹ کی کتاب Controlling the Sword: The Deomcratic Governance of National Security, Harvard Univeristy Press, Cambridge MA, 1990 بہت اہم ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں اور روبرٹ جوہانسن کے اس مضمون میں جس کا حوالہ پہلے دیا گیا ہے بڑی تفصیل سے ان وجوہ' دلائل اور تجربات کو بیان کیا گیا ہے جن کا حاصل فوج پر سول کنٹرول کا اصول ہے۔ ہن ٹنگٹن نے فوجی ذہن اور نفسیات کی صحیح عکاسی کی ہے اور اس نے ایک جملے میں پورے فوجی ذہن اور خود ہمارے جرنیل صاحب کے ذہن کی حقیقی عکاسی کر دی ہے۔

> اس کو جمہوریت کا مخالف بھی خیال کیا جاتا ہے اور وہ معاشرے کی تنظیم' سلسلہ احکامات (chain of command) کی بنیاد پر کرنا چاہتا ہے۔ (ص ۶۰)

ہن ٹنگٹن پوری بحث کا اصولی نتیجہ اس طرح پیش کرتا ہے:

> فوجی افسران کو سیاسی طور پر غیر جانب دار رہنا چاہیے۔ (ص ۷۱)

وہ فوجی قیادت کے وظیفے کو تین نکات میں بیان کرتا ہے: ۱- سلامتی کی حقیقی ضرورتوں کا ادراک اور ان کو سیاسی قیادت کے سامنے پیش کرنا' ۲- سلامتی کے حالات اور خطرات کے بارے میں اپنے خصوصی نقطۂ نظر کے بیان کے ذریعے سیاسی قیادت کی مدد کرنا۔ ۳- جو فیصلہ سیاسی قیادت کرے' اسے نافذ کرنا۔

فوج کا کام کاروبارِ سیاست چلانا نہیں۔ مصنف کتاب کو اس نتیجے پر ختم کرتا ہے:

> فوجیوں پر جو امن کے محافظ ہیں' بڑی بھاری ذمہ داری آتی ہے۔ وہ سب سے بڑی خدمت یہ انجام دے سکتے ہیں کہ اپنے آپ سے سچے رہیں اور فوجی روایت کے مطابق خاموشی اور جرأت سے خدمت کریں۔ اگر وہ فوجی جذبے کو مجروح کرتے ہیں تو وہ سب سے پہلے اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں اور بالآخر اپنی قوم کو۔ اگر شہری' فوجیوں کو فوجی معیارات سے وابستہ رہنے کی اجازت دیں تو قومیں ان معیارات کو اپنانے سے خود بالآخر نجات اور سلامتی پائیں گی۔ (ص ۴۶۶)

یہ سب اس لیے کہ فوج سیاست میں آ کر ملک کی فوج نہیں رہ سکتی۔ اگر جرنیل سیاسی اقتدار حاصل کر لیں تو ان کا حشر بھی ان انقلابیوں کا سا ہوتا ہے جو نظریے کے نام پر اقتدار میں آتے ہیں اور نظریہ ہی ان کا

پہلا شکار ہوتا ہے۔

جنرل اور ایڈمرل' نہ کہ پیشہ ورانہ فوجی اخلاق' فتح یاب ہو سکتے ہیں۔ سیاسی طاقت کا اثر ان کو اچھا لبرل' اچھا فاشسٹ یا اچھا کمیونسٹ بنا سکتا ہے لیکن وہ خراب پیشہ ور ہوں گے۔ پیشہ ورانہ کارکردگی اور پیشہ ورانہ ضابطے کی پابندی کے اطمینان کی جگہ' اقتدار' منصب' دولت' مقبولیت اور غیر فوجی گروہوں کی تحسین سے ملنے والا اطمینان لے لیتا ہے۔ (۹۵)

کانٹے کی بات یہ ہے کہ:

سول کنٹرول جمہوری عمل کی شناخت ہے' جب کہ فوجی کنٹرول مطلق العنان اور کلّی حکومت سے پہچانا جاتا ہے۔ (ص۸۲)

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ فوجی اور سول دائروں کا مکمل ادغام جرمنی میں نازی دور میں ہوا اور اشترا کی نظام میں بھی فوج اور پارٹی میں گہرا رشتہ تھا۔ جمہوری نظام میں فوج کو سول حکومت کے تابع رکھا جاتا ہے اور یہی چیز فوج کی پیشہ ورانہ مہارت کی ضامن ہے۔ ہن ٹنگٹن اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

معروضی طور پر دیکھا جائے تو سول کنٹرول سے فوجی پیشہ ورانہ مہارت کا معیار اعلیٰ ہو جاتا ہے۔ زیادہ درست بات یہ ہے کہ فوجی اور سول گروہوں میں سیاسی طاقت کی تقسیم سے افسران کو پیشہ ورانہ رویے اختیار کرنے میں تقویت ملتی ہے۔

روبرٹ جوہانسن انتباہ کرتا ہے:

مستحکم جمہوری معاشروں میں بھی جمہوریت کو شاید سب سے زیادہ عصری چیلنج فوجی دائرے میں درپیش ہے۔ (Prospects for Democracy' ص۲۱۳)

معاشرے میں عسکری ذہن جس حد تک سرایت کرتا ہے مطلق العنانیت مضبوط ہوتی ہے اور جمہوریت کی بیخ کنی ہوتی ہے۔ سیاسی لحاظ سے سیاسی پارٹیوں کے درمیان مقابلے کے عمل کو جمہوریت کی پہچان سمجھا جاتا ہے۔ یہ عمل داخلی اور عسکری مسائل پر سیاسی لحاظ سے پھر نہیں ہوتا۔ (ص ۲۱۶-۲۱۷)

جوہانسن جس نتیجے پر پہنچا ہے وہ یہ ہے:

ہمیں چاہیے کہ جمہوریت کے تقاضوں کے تحت فوجی مطالبات کو محدود کریں بجائے اس کے کہ فوجی مطالبات کے تحت جمہوری تقاضوں کو محدود کریں۔ (ص ۲۳۰)

جوہانسن کے خیال میں ''قومی سلامتی'' کے جمہوری تصور کی تفہیم ضروری ہے تا کہ نظام حکومت فوجی

ذہن کی گرفت سے نکل کر حقیقی جمہوری تقاضوں اور تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم ہو سکے۔ یہ صرف سول قوتوں کی بالادستی ہی میں ممکن ہے۔

اس بحث کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ صدر مملکت کا آرمی چیف آف اسٹاف رہنا اور پارلیمنٹ وزیراعظم اور صوبائی منتخب نظام کے سر پر کسی بھی عنوان سے ایک غیر منتخب ''قومی سلامتی کونسل'' کا وجود ملک کو سول حکمرانی کے نظام سے ایک قسم کی فوجی حکمرانی کے نظام کی طرف لے جائے گا جو جمہوریت کی نفی' وفاقیت کی موت اور فوج کے لیے کمزوری بلکہ تباہی کا راستہ ہے۔ بی این آر کی دستاویز میں بڑے معصوم انداز میں اس ادارے کو ''مشاورتی ادارہ'' قرار دیا گیا ہے' حالانکہ اپنی ترکیب اور تاریخی پس منظر کے اعتبار سے عملاً یہ فوجی صدر کی اصل کابینہ کا کردار ادا کرے گی اور اس طرح ملک جمہوری قبا میں مارشل لا کے نظام کے تحت آجائے گا جو ترقی معکوس کی بدترین شکل ہوگی۔

قومی سلامتی کونسل کے سلسلے میں ترکی اور امریکہ کی مثالیں دی جارہی ہیں لیکن یہ مغالطہ دینے کی ایک افسوس ناک کوشش ہے۔ جہاں تک ترکی کا معاملہ ہے وہاں جنرل کنعان ایورن کے مارشل لا کے دور میں جو نیا دستور بنایا گیا اس میں ایک ایسی کونسل بنائی گئی جس میں نصف سویلین اور نصف فوجی ہیں۔ اس کا ایجنڈا صدر' وزیراعظم یا آرمی چیف کے مشورے سے بنتا ہے اور یہ کابینہ یا پارلیمنٹ کو مشورہ دیتی ہے۔ اس کا خاص پس منظر یہ ہے کہ پہلے دن سے جدید ترکی میں فوج کا ایک خاص کردار رہا ہے۔ دولت عثمانیہ کے انتشار کے وقت یہ ترکی فوج تھی جس نے یورپ کی استعماری طاقتوں کا مقابلہ کرکے اناطولیہ اور تھوڑے سے مزید علاقے کو آزاد رکھا اور جدید ترکی کی ریاست قائم ہوئی۔ اس وقت سے ترکی کی فوج ایک خاص کردار ادا کر رہی ہے لیکن دوسرے ممالک میں فوج کی یہ تاریخی پوزیشن نہیں۔ اس کے باوجود ترکی میں کونسل کے بیس سالہ تجربے پر سیاسی حلقوں میں شدید اضطراب اور اختلاف ہے اور ترکی کے ایک جمہوری ریاست کی حیثیت سے ترقی کرنے کی راہ میں یہ ادارہ رکاوٹ ہے۔ اس کے نتیجے میں نہ سیاسی استحکام آیا اور نہ معاشی استقرار' بلکہ سیاسی اُلٹ پلٹ میں اس کا ایک کردار رہا ہے جو عدم استحکام کا ذریعہ بنا ہے۔ کوئی بھی غیر جانب دار مبصر اسے ترکی کے حق میں ایک سراسر خیر قرار نہیں دے سکتا بلکہ اس وقت ترکی میں جو سیاسی مباحث ہو رہے ہیں ان میں فوج کے کردار پر نظر ثانی کی بات کو فوقیت حاصل ہے۔ ہمارے لیے ترکی کا یہ ادارہ کسی اعتبار سے بھی مثال نہیں بن سکتا۔

جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے' وہاں نیشنل سیکورٹی کونسل کی تاریخ' کردار اور کارکردگی اس سے قطعاً مختلف بلکہ اس کی ضد ہے جو ہمارے یہاں تجویز کی جا رہی ہے۔ تعجب ہے کہ این بی آر کی دستاویز میں سب سے پہلے امریکہ کی نیشنل سیکورٹی کونسل ہی کا ذکر ہے۔ کیا فی الحقیقت جنرل پرویز صاحب کے اس مرکز دانش

(think tank) کی معلومات کا یہی حال ہے کہ وہ اس ادارے کی تاریخ اور کردار کو اپنے لیے نظیر بنانے کی جسارت کر رہے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ میں آزادی کی جنگ فوج نے لڑی لیکن دستور اور دستوری اداروں میں اس کا کوئی کردار نہ تھا۔ ابراہام لنکن کے زمانے میں فوج ہی نے سول وار کو فرو کیا لیکن اس کے بعد بھی فوج کا کوئی سیاسی یا دستوری کردار نہیں تھا۔ یہی صورت حال ۱۹۴۰ء تک رہی۔ البتہ دوسری جنگ کے دوران غیر محسوس اور ماورائے قانون انداز میں حکومت کے معاملات میں فوج کا عمل دخل بڑھ گیا۔ جوائنٹ چیف کا ادارہ ایک عسکری کمانڈ کا ادارہ ہی نہ رہا بلکہ اس کا سیاسی کردار بھی ایک حقیقت بن گیا۔ اس کا سربراہ تمام فوجی امور میں عملاً صدر کا مشیر بن گیا اور اس نے اتنے بال و پر نکال لیے کہ وہ ایک متبادل تو نہیں لیکن قابل ذکر اور بااثر مستقل بالذات اساسِ قوت (power base) بن گیا اور جنگ ختم ہو جانے کے باوجود سرد جنگ کے بہانے اس نے سیاسی قوت کے ایک مرکز کی شکل اختیار کر لی۔ ۱۹۴۷ء کا نیشنل سیکورٹی ایکٹ اور اس کے بعد ۱۹۴۹ء اور بعد کی ترامیم کے ذریعے جوائنٹ چیف کے اس فوجی ادارے کے پر کاٹے گئے اور بالآخر اسے اس کی حدود میں لا کر مکمل طور پر سیاسی قیادت کے قابو میں لے آیا گیا۔ نیشنل سیکورٹی کونسل بھی اصلاً ایک سیاسی ادارہ ہے اور اس کے تمام ارکان (بجز ایک چیف آف جوائنٹ اسٹاف) سویلین ہیں۔ اس کا مقصد فوج کی شرکت یا مشاورت نہیں' ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان جو حجم اور جو کام (function) فوج کے اعلیٰ ادارے نے حاصل کر لیے تھے' ان سے گلوخلاصی تھا۔ اس کے لیے نصف درجن سے زیادہ اقدام کیے گئے۔

اول: وزارت دفاع کی تنظیم نو کی گئی۔ جوائنٹ چیف جو براہ راست صدر کو عسکری امور پر مشورہ دیتا اور حالات سے باخبر رکھتا تھا' اسے وزارت دفاع کے سیکرٹری سے جو سویلین ہوتا ہے' مربوط کیا گیا۔ سیکرٹری دفاع کو جوائنٹ چیف کی میٹنگ میں شرکت کا حق دیا گیا جو بعد میں بڑھا کر اس کی صدارت میں کر دیا گیا۔ جب فوج میں اس پر کچھ تحفظات کا اظہار ہوا تو سیکرٹری دفاع کو فوج کا ڈپٹی کمانڈر ان چیف بنا دیا گیا۔ اور اس طرح پنٹاگون کو سول نظام کے تحت لے آیا گیا۔ اب سیکرٹری دفاع' نہ کہ جوائنٹ چیف' صدر کا عسکری امور پر مشیر اعلیٰ ہے' اسی طرح حکمت عملی اور تجزیہ' سیکرٹری دفاع کی ذمہ داری قرار دی گئی اور جوائنٹ چیف کا دائرہ کار فوجی امور اور پیشہ ورانہ معاملات تک محدود کر دیا گیا۔

دوم: قومی سلامتی کونسل قائم کی گئی' جو کوئی دستوری ادارہ نہیں بلکہ ملکی قانون کے تحت ایک ادارہ ہے جس کا مقصد صدر کو سلامتی کے امور پر مشورہ دینا ہے۔ پہلے تمام افواج کے سربراہوں کا صدر سے براہِ راست رابطہ تھا۔ اب جوائنٹ چیف اپنی مجلس میں جو تجاویز طے کریں گے' ان کو صرف ان کا سربراہ قومی سلامتی کونسل میں لاتا ہے۔ صرف وہ ایک فرد کونسل کا رکن ہے' باقی تمام ارکان سویلین ہیں۔ عام حالات میں جوائنٹ چیف'

سیکرٹری دفاع اور قومی سلامتی کونسل کو حالات سے آگاہ کرتا ہے اور اس طرح صدر تک راست پہنچ جو ۱۹۴۰-۴۷ء میں معمول کا درجہ اختیار کرگئی تھی' اس میں قرار واقعی کمی ہوئی۔ امریکہ میں قومی سلامتی کونسل کا کوئی کردار کانگریس کو کنٹرول کرنے یا متاثر کرنے کے باب میں نہیں۔ وہ صرف قومی سلامتی اور حکمت عملی کے امور پر توجہ مرکوز رکھتی ہے۔ یہ ایک خالص سول ادارہ ہے۔ امریکہ میں صدر' اسمبلی کو برطرف نہیں کرسکتا اور نہ اس کے انتخابات کے انعقاد میں کوئی کردار ادا کرسکتا ہے۔

سوم: ۱۹۴۰ء-۱۹۴۷ء میں جوائنٹ چیف کے سپرد صرف صدر کو مشورہ اور فوج کے پیشہ ورانہ امور ہی نہ تھے' بلکہ مالیاتی اور انتظامی معاملات بھی اس کے پاس تھے اور اس طرح وہ ایک تقریباً خودمختار مرکز قوت بن گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے قانون کے تحت ایک نیا ادارہ Office of the Comptroller (دفتر ناظر حسابات) بنایا گیا جس نے جوائنٹ چیف سے انتظامی اور مالی معاملات کا چارج لے لیا اور بعد میں ایک سویلین اسسٹنٹ سیکرٹری دفاع اس شعبے کا انچارج بنا دیا گیا۔

چہارم: جنگ کے زمانے میں معلومات' خفیہ اطلاعات اور ملٹری ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ کے تمام کام بھی جوائنٹ چیف کے ماتحت تھے' اور اس طرح معلومات اور تجزیے پر اسے مکمل کنٹرول تھا۔ ۱۹۴۷ء کے سیکورٹی ایکٹ کے تحت یہ سارا کام بھی جوائنٹ چیف سے لے لیا گیا اور اس کے لیے خالص عسکری معلومات اور تحقیق کا کام سیکرٹری ڈیفنس کے تحت اور عام سلامتی کے حوالے سے خفیہ معلومات کے لیے ایک نیا ادارہ سی آئی اے بنایا گیا جو جوائنٹ چیف کے بجائے قومی سلامتی کونسل سے مربوط کیا گیا۔

پنجم: جنگ کے زمانے میں ایٹمی توانائی اور جوہری ہتھیاروں کا پورا نظام جوائنٹ چیف کے تحت تھا۔ لیکن بڑی ردوکد اور بحث و مباحثے کے بعد ۱۹۴۶ء میں میک موہن ایکٹ کے ذریعے سے یہ سارا کام بھی ایک سویلین اٹامک انرجی کمیشن کے سپرد کر دیا گیا جو بلاواسطہ صدر کے تحت کام کرتا ہے۔

ششم: جوائنٹ اسٹاف جرمنی' جاپان اور تمام مفتوحہ علاقوں پر حکمرانی کا اختیار رکھتے تھے' وہ بھی ان سے لے لیا گیا۔

ہفتم: ملٹری پروڈکشن کا وہ کام جو جنگ کے دوران جوائنٹ اسٹاف کے تحت تھا اور اس میں صرف اسلحہ ہی نہیں معاشی پیداوار بھی شامل تھی' وہ بھی ان کے دائرے سے نکال کر صدر کے انتظام میں دے دیا گیا۔

اس طرح دراصل قومی سلامتی ایکٹ اور دوسرے قوانین اور انتظامی احکام کے ذریعے فوج کے سول معاملات ہی نہیں خود فوجی معاملات میں بھی کردار کو کم کیا گیا اور قومی سلامتی کے تمام امور کو فوج کے انتظام سے نکال کر سول نظام میں دے دیا گیا۔ قومی سلامتی کونسل اس کا ایک اہم ذریعہ رہی ہے۔ سیموئیل ہن ٹنگٹن اس

کے بارے میں اس رائے کا اظہار کرتا ہے:

> صدر کو قومی سلامتی کی پالیسی کے بارے میں مشورہ دینے کی ذمہ داری جو جنگ کے دوران جوائنٹ چیف آف اسٹاف نے ادا کی تھی' نیشنل سیکورٹی کونسل کو تفویض کر دی گئی جس میں اعلیٰ ترین سول افسران شامل ہیں۔ جوائنٹ چیفس کو فوجی سرگرمیوں تک محدود کرنے میں اس ایجنسی کے قیام نے کسی بھی دوسرے تنظیمی اقدام کے مقابلے میں زیادہ اہم کردار ادا کیا۔ (ص ۴۳۴)

ان تمام تبدیلیوں کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ جوائنٹ چیف اور ان کا چیئرمین صرف "فوجی نقطۂ نظر" کی ترجمانی تک محدود ہو گئے۔ اس طرح عسکری بحث کے پورے عمل سے رفتہ رفتہ جوائنٹ چیف کو عملاً بے دخل کر دیا گیا اور کمپٹرولر کے دفتر نے یہ سارا نظام سنبھال لیا۔ اس کے ساتھ جوائنٹ چیف پارلیمنٹ کی کمیٹی براے افواج کے سامنے جواب دہ بھی ہیں۔ اور ان کا بجٹ بھی کانگریس کے تابع ہے اور تمام اخراجات متعلقہ کمیٹی کے ذریعے ہوتے ہیں۔ ہن ٹنگٹن کے الفاظ میں ۱۹۴۵ء میں یہ کیفیت تھی کہ جوائنٹ چیف آف اسٹاف ایک مرکز قوت تھے۔ ایڈمرل لی لی کے الفاظ میں: کسی بھی طرح کے سول کنٹرول میں نہیں۔ لیکن اس پورے عمل کا مقصد ان کو دوبارہ فوج کے دائرے میں لے آنا تھا۔

> لہٰذا بنیادی ضرورت یہ تھی کہ جوائنٹ چیفس کو ان کے غیر فوجی وظائف سے ہٹا کر صرف فوجی امور تک محدود کیا جائے اور ایسے مناسب ادارے تشکیل دیے جائیں جو انتظامی امور' پالیسی اور حکمت عملی سے متعلق ذمہ داریوں کو ادا کریں۔ (ص ۴۲۸)

امریکہ نے فوج کو ایک پیشہ ورانہ فوج رکھنے کے لیے وہ تمام اقدام کیے جس کے نتیجے میں سول کنٹرول دوبارہ قائم ہو گیا۔ ہمارا قومی ادارہ تعمیر نو اور جنرل پرویز مشرف صاحب بالکل اس کے برعکس کارنامہ انجام دینا چاہتے ہیں اور سول نظام پر فوج کا کنٹرول قائم کرنے کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور ستم ظریفی ہے کہ اس کے لیے امریکہ کی مثال پیش کرنے کی جسارت بھی کرتے ہیں۔ قومی تعمیر نو بیورو امریکہ میں ان اداروں کے قیام کی غرض و غایت اور تاریخ سے واقف نہیں یا قوم کو مغالطہ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ دونوں ہی ناقابل معافی جرم ہیں۔

پارلیمانی نظام کا مسئلہ

چوتھا مسئلہ پارلیمانی نظام کا ہے۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ کون سا نظام اچھا ہے: پارلیمانی یا صدارتی۔ اس دور سے ملک گزر چکا ہے اور اس پر قومی اتفاق رائے ہے کہ ہمارے لیے پارلیمانی نظام ہی بہتر ہے اور صدارتی انتخاب کے جو دستوری (جنرل ایوب کے دس سال) اور غیر دستوری (جنرل یحییٰ' صدر بھٹو'

جنرل ضیاالحق اور جنرل پرویز مشرف) ادوار کا تجربہ ہے وہ بھی شاہد ہے کہ صدارتی نظام ہمارے مسائل کا حل نہیں۔ اصل خرابی دستوری نظام میں نہیں اس پر عمل کرنے والوں اور ان کے طور اطوار میں ہے۔ پارلیمانی نظام میں اس کے فریم ورک کو متاثر کیے بغیر بہت سے چیک اینڈ بیلنس ہیں اور مزید پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ پارلیمنٹ اس پر بحث اور غور کرسکتی ہے اور دنیا کے دستوری تجربات کی روشنی میں دسیوں مشورے دیے جاسکتے ہیں۔ ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وزیراعظم ہوں یا صدرمملکت، کوئی بھی اپنے دائرہ کار میں رہ کر قانون اور روایات کے مطابق کام نہیں کرنا چاہتا اور اپنے ہاتھ میں زیادہ سے زیادہ طاقت لے کر اپنی من مانی کرنا چاہتا ہے۔

اس وقت جو ترامیم لائی جارہی ہیں وہ پارلیمانی نظام کا حلیہ بگاڑ دیں گی۔ پارلیمنٹ، وزیراعظم اور اس کی کابینہ صدر کے سامنے تابع مہمل کا مقام اختیار کرلے گی، اس کے خوف کے تحت زندگی گزارے گی اور عوام کے مینڈیٹ کے کوئی معنی باقی نہیں رہیں گے۔ صدر کسی پالیسی کے عوامی مینڈیٹ کے تحت منتخب نہیں ہوتا۔ اس کی حیثیت علامتی ہے، لیکن ان ترامیم کے ذریعے اسے ''قادر مطلق'' بنایا جا رہا ہے۔ جو صواب دیدی اختیارات اس کو دیے جارہے ہیں وہ جنرل ایوب اور جنرل ضیاالحق دونوں کے خود حاصل کردہ اختیارات سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ وزیراعظم وہ اپنی مرضی سے نامزد کرسکتے ہیں جسے چھ مہینے ملیں گے کہ جوڑ توڑ کے ذریعے اپنا الّو سیدھا کرلے۔ جب چاہیں وہ اسمبلی کو، یا وزیراعظم کو، یا اس کی کابینہ کو برطرف کرسکتے ہیں۔ تمام اہم عہدوں پر تقرری کا مکمل اختیار ان کو ہوگا۔ یہی معاملہ صوبوں میں گورنروں کے تقرر کا ہے۔ پھر ان کے نامزد گورنروں کو اسی طرح صوبوں میں وزراعلیٰ بنانے اور اسمبلیوں کو قابو میں رکھنے کا اختیار ہوگا۔ بظاہر وہ غیرانتظامی (non executive) صدر ہوں گے لیکن فی الحقیقت اصل حکمران ہوں گے اور ہلانے والے تمام تار ان کی انگلیوں میں ہوں گے۔ یہ ایک صدارتی نظام ہے جس پر ایک طرف ملٹری کی قوت کا سایہ ہے تو دوسری طرف وہ ہر اس پابندی اور تحدیدات سے آزاد ہوگا جو صدارتی نظام کو بھی کچھ حدود کا پابند کرتا ہے۔ صواب دیدی اختیارات ہی دراصل مطلق العنان حکومت کی جڑ ہے اور ان ترمیمات کے ذریعے ایک ایسا صدر تراشا جارہا ہے جو ہر گرفت سے بالا ہو اور من مانی کرسکے اور کرواسکے۔

کسی بھی پارلیمانی نظام کی کم سے کم خصوصیات یہ ہیں کہ:

۱- بااختیار پارلیمنٹ، جو عوام کے براہِ راست ووٹ سے ایک متعین مدت کے لیے منتخب ہو اور عوام اس میں سیاسی جماعتوں کو ان کے منشور کی بنیاد پر محدود حکمرانی کا اختیار دیں۔ یہ حدود یا دستور مقرر کرتا ہے یا عوامی مینڈیٹ۔

۲- انتظامیہ اپنے اختیارات اور حق حکمرانی پارلیمنٹ سے حاصل کرتی ہے اور اسی کے سامنے جواب

دہ ہوتی ہے۔ وزیراعظم ان کا منتخب کردہ اور کابینہ ان میں سے اور ان کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔

۳- وزیراعظم اور کابینہ/ انتظامیہ کو ہٹانے کا اختیار منتخب پارلیمنٹ کو حاصل ہو جو ان کی کارکردگی پر بلاواسطہ یا اپنی منتخب کردہ کمیٹیوں کے ذریعے مسلسل نظر رکھے۔ صدارتی نظام کے برعکس' پارلیمانی نظام میں قانون ساز ادارہ اور انتظامیہ میں وظائف کے اعتبار سے تو فرق ہے لیکن افراد کا اشتراک ہوتا ہے جب کہ صدارتی نظام میں وظائف کی علیحدگی کے ساتھ افراد کی علیحدگی بھی ہوتی ہے۔

اب دیکھیے' ان مجوزہ ترامیم کے ذریعے پارلیمنٹ اور انتظامیہ دونوں کی کس طرح قلب ماہیت ہوگئی ہے۔

۱- پارلیمنٹ خود وزیراعظم/ اپنا قائد منتخب نہیں کرے گی بلکہ صدر کسی شخص کو نامزد کردے گا جو چھے ماہ میں اعتماد کا ووٹ لے گا۔

۲- وزیراعظم اور پارلیمنٹ' کابینہ کی تشکیل کریں گے لیکن صدر جب چاہے وزیراعظم یا کابینہ کو برطرف کرسکتا ہے۔

۳- قومی سلامتی کونسل کا غیر منتخب ادارہ پارلیمانی نظام کے قانونی اور انتظامی عمل کے ادغام کے اصول کی نفی کرتا ہے۔

۴- وزیراعظم انتظامیہ کا سربراہ ہوگا جس کے معنی ہیں کہ فوج اور سول دونوں کی پوری انتظامیہ اس کے ماتحت ہوگی لیکن وہ ان میں سے کسی کے بھی سربراہ کو نہ مقرر کرسکتا ہے اور نہ ہٹا سکتا ہے بلکہ یہ پوری ٹیم اس پر صدر اپنی صواب دید سے مسلط کرتا ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ پوری انتظامیہ صدر کے ہاتھ میں ہوگی اور وزیراعظم ایک بے اختیار فرد بن کر رہ جائے گا۔ صدر کے لیے بھی کوئی ضابطہ' کوئی قانون اور کوئی راہنما اصول نہیں ہے۔ ہر کام وہ اپنی صواب دید میں کرنے کا مجاز ہے۔ فوج کے چاروں سربراہوں کا تقرر' گورنروں کا تقرر' پبلک سروس کمیشن کے سربراہ کا تقرر' الیکشن کمیشن کے سربراہ کا تقرر۔

۵- اسی طرح صوبوں میں گورنر وہ سارے اختیارات رکھیں گے جو مرکز میں صدر کو حاصل ہیں اور برطرفی کے اقدامات وہ صدر کے مشورے سے کریں گے۔

جب اقتدار کا نقشہ بنانے اور بگاڑنے اور اہم تقرریاں کرنے اور ان میں تبدیلی کے تمام اختیارات صدر کو دے دیے گئے اور صدر محض اپنے اختیار سے چیف آف آرمی اسٹاف بھی رہ سکتا ہے تو پھر اس نظام میں پارلیمانی نظام کی کون سی خصوصیت باقی رہ گئی؟

جو نقشہ تجویز کیا گیا ہے اس میں صدر کی بالادستی اور شخصی حکمرانی کا پورا پورا بندوبست کیا گیا ہے اور پھر

اس نظام کو چلانے کے لیے جوڑتوڑ‘ سیاسی صف بندیاں‘ وفاداریوں کی تجارت اور سرپرستی کی سیاست راہ پائے گی۔ ایسے نظام کے چلنے کا انحصار ہی صرف ان حربوں پر ہے۔ نہ سیاسی جماعتیں مضبوط ہوسکیں گی اور نہ کوئی جمہوری روایات پنپ سکیں گی۔ یہ سیاست کے انتشار اور صحت مند حکمرانی کے خاتمے کا نسخہ ہے۔

وفاقیت کا اصول

ان ترامیم سے ہمارے اختلاف کا پانچواں پہلو وفاقیت کے بارے میں ہے۔ فوجی حکومت کا ہر دور ایک وحدانی حکومت کا دور رہا ہے اور ملک میں علاقائیت اور علیحدگی پسندی کے رجحانات کو تقویت دینے کا باعث ہوا ہے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں جو وفاقی نظام کا نقشہ ہے اس کے ۸۰ فی صد پر آج تک عمل نہیں ہوا۔ مرکز میں ۱۴ وزارتیں ایسی ہیں جن کا کوئی جواز نہیں۔ قانون سازی میں مشترک فہرست کو بے محابا استعمال کیا گیا ہے۔ وفاق کے اہم اداروں کو وجود ہی میں نہیں لایا گیا یا غیر موثر بنا دیا گیا۔ اور اب صدر کو جو اختیارات دیے جارہے ہیں وہ وفاقی نظام کو ایک طرح کے وحدانی نظام میں تبدیل کرنے کی کوشش ہے۔ فوج کو ہم ایک قومی فوج دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اس میں چند علاقوں کا ارتکاز ویسے بھی تشویش ناک ہے لیکن فوج کے سیاسی کردار کے ذیل میں تو یہ اور بھی خطرناک اور مرکز گریز رجحانات کو تقویت دینے کا باعث ہوگا۔ گورنروں کے تقرر کو جس طرح صدر کے ہاتھوں میں منتقل کر دیا گیا ہے اور پھر گورنروں کو صوبائی نظام کو شکست و ریخت میں جو کردار دیا گیا ہے اس سے وفاقیت کا اصول بری طرح مجروح ہوا ہے۔ لوکل گورنمنٹ کے نظام نے بھی مرکز کے لے پالک کی شکل میں جنم لیا ہے اور صوبائی نظام سے اس کے ربط کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ گویا صوبوں کو دونوں طرف سے مجروح کر دیا گیا ہے۔ یہ فیڈریشن کے بنیادی تقاضوں کے منافی ہے اور اس خطرناک راستے پر بڑھنے والا ہر قدم قومی سلامتی‘ ملکی استحکام اور جمہوریت کے فروغ کی راہ کا روڑا ہے۔

عدالت نے جن تین تحدیدات کی نشان دہی کی تھی‘ ان ترامیم کے ذریعے ان تینوں کو پامال کر دیا گیا ہے اور اداروں کو غیر سیاسی بنانے کے اصول کی دھجیاں فوج کو واضح سیاسی کردار دے کر خود بکھیر دی گئی ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر

اسلامی نقطۂ نظر سے یہ تمام انحرافات قابل گرفت ہیں۔ اسلام عدل و انصاف کے ساتھ عہد و پیمان کے احترام کا قائل ہے اور ۱۹۷۳ء کا دستور ایک میثاق ملّی کی حیثیت رکھتا ہے جس کا ان ترامیم کے ذریعے مُثلہ کیا جارہا ہے۔

یہ حکومت امریکہ نوازی کے شوق میں‘ جہاد کے خلاف‘ دینی مدارس کے خلاف اور اسلامی ثقافت...

روایات کے خلاف اقدامات بے باکی سے کرتی چلی جارہی ہے۔ سپریم کورٹ کے شریعت بنچ سے ایک معروف اور معتمد علیہ عالم دین کو بیک بینی و دو گوش ہٹا کر اپنی مرضی کے ججوں کا تقرر کر کے سود کے حق میں مرضی کا فیصلہ لیا ہے۔ سیکولر کلچر اور سیاست کے فروغ کے اقدامات سے دستور کی اسلامی دفعات کی بھی خلاف ورزی کی ہے۔ ان ترامیم میں مخلوط انتخاب کے اصول کو قوم پر مسلط کر کے اسلامی تعلیمات سے انحراف اور سیکولر اور مخلوط سیاست کی طرف قدم اٹھایا ہے۔

یہ وہ چھے وجوہ ہیں جن کی بنیاد پر ہم ان ترامیم کو ملک وملت کے لیے سخت نقصان دہ سمجھتے ہیں اور اس امر کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ یہ قوم ان کو اس شکل میں کبھی قبول نہیں کرے گی اور اگر زبردستی انھیں قوم پر مسلط کیا جاتا ہے تو ان کے خلاف سیاسی جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ان سے نجات حاصل نہیں کر لی جاتی۔

اپنے اس ہدف اور عزم کے اظہار کے ساتھ ہم یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ موجودہ حالات میں حکومت کے غلط اقدامات اور دستور و جمہوریت کے معروف اصولوں اور اسلامی اقدار کے خلاف مسلط کی جانے والی دستوری ترامیم اور سیاسی کارگزاریوں کا مقابلہ کرنے کا واحد راستہ اکتوبر کے انتخابات میں بھرپور شرکت اور ایک ایسی حکمت عملی پر پیش رفت ہے جس سے نئی اسمبلیوں میں قوم کے حقیقی ترجمان پہنچ سکیں اور اسلام اور جمہوریت کی جنگ کو یقین' کردار اور اتحاد کے ساتھ لڑ سکیں۔

ہم سمجھتے ہیں اب عدالتی جنگ کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ عدالت خود جن مشکلات اور مجبوریوں کی گرفت میں ہے اس میں اس سے اس وقت کوئی بڑی توقع عبث ہے۔ سپریم کورٹ نے حال ہی میں ریفرنڈم اور پھر سود کے مسئلے پر جس کمزوری کا مظاہرہ کیا ہے اس نے اس پر عوام کے اعتماد کو مجروح کیا ہے۔ ریفرنڈم کے خلاف اپیل نے اس کو ایک تاریخی موقع دیا تھا کہ جرأت اور عزیمت کا راستہ اختیار کرتی اور کم از کم اتنا ہی کہہ دیتی کہ ریفرنڈم کے ذریعے انتخاب کی دستور میں کوئی گنجایش نہیں لیکن اس نے رخصت اور فرار کا راستہ اختیار کیا اور عبوری دستور کا سہارا لے کر' جس کے تحت خود عدالت نے حلف لیا تھا' اس شرم ناک کھیل کو جاری رکھنے کا جواز فراہم کر دیا اور اصل مسئلے کو آیندہ دستور کی بحالی اور پارلیمنٹ پر ٹال دیا۔ سود کے معاملے میں بھی حکومت جو چاہتی تھی اس کے لیے راستہ نکال دیا گیا اور ایک بار پھر مسئلے کو وفاقی شرعی عدالت کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ ان حالات میں عدالت کی جنگ لاحاصل ہے۔ اب تو اصل معرکہ پارلیمنٹ میں ہونا ہے اور اس کے لیے ساری توجہ انتخابات پر ہونی چاہیے کہ ایک طرف عوام کو بیدار کیا جائے' اصل مسائل سے ان کو روشناس کیا جائے' دلائل سے حالات اور خطرات سے آگاہ کیا جائے اور دوسری طرف سیاسی اور دینی قوتیں نازک حالات اور گمبھیر

خطرات کے پیش نظر اتفاق و اتحاد اور تعاون اور ہم آہنگی کا راستہ اختیار کریں تاکہ ایسے جان دار' بے داغ اور اصول کے پکے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں اور سینیٹ میں پہنچے جو پاکستان کے قیام کے اصل مقاصد کی حفاظت کر سکے' دستور کو بیخ کنی سے بچا سکے اور جنرل پرویز مشرف اور فوج کو یہ پیغام دے سکے کہ انھیں اپنی روش بدلنا ہوگی۔

جنرل صاحب کو اگر سیاست کا شوق ہے تو وردی اُتار کر آئیں اور قسمت آزمائی کریں۔ فوج کی ہر حقیقی ضرورت کو پورا کرنا قوم کی ذمہ داری ہے لیکن فوج کا بھی فرض ہے کہ وہ خود کو فوجی معاملات تک محدود کرے اور دفاع وطن کے لیے پوری قوم کی امیدوں کا مرکز بن جائے۔ جنرل پرویز مشرف نے افغانستان کی پالیسی کو تبدیل کر کے دوست تو کوئی حاصل نہیں کیا بے شمار دشمن پیدا کر لیے ہیں۔ اسی طرح اب کشمیر پر یوٹرن کے لیے پر تول رہے ہیں بلکہ آغاز کر چکے ہیں اور بھارت کو لڑائی کے بغیر اپنے مقاصد حاصل کرنے کا موقع دے رہے ہیں۔ ان کی آشیرباد سے امریکی فوجی اور ایف بی آئی کے کارندے ہماری سرزمین پر اپنے مقاصد کے لیے کارروائیاں کر رہے ہیں اور کرا رہے ہیں۔ اس صورت حال نے صرف جنرل صاحب ہی نہیں پوری فوج کے امیج کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ ہم فوج کے اصل امیج کو بحال کرنا چاہتے ہیں اور اعتماد اور تعاون کا وہ نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں فوج حدود میں رہے' سول کنٹرول کو بالادستی حاصل ہو' لیکن نہ فوج کو سیاست میں دراندازی کی ضرورت اور موقع ہو اور نہ سیاست دان اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کی جرأت کر سکیں۔

سیاسی جماعتوں اور کارکنوں کو بھی اس پورے بحران سے بڑے اہم سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ نئی اسمبلیوں میں ایسے افراد کے آنے اور سیاسی جماعتوں کے درمیان ایسی باہمی تفہیم کی ضرورت ہے کہ حکمت اور دانش مندی کے ساتھ ملک و ملت کو موجودہ دلدل سے نکالا جا سکے۔ یہ تین سال ہمارے گم شدہ سال ہیں لیکن تلافی کے امکانات ہیں اور اب ساری توجہ تلافی مافات اور پاکستان کی تعمیرنو ان اصولوں اور مقاصد کے مطابق کرنے کی جدوجہد پر صرف کرنے کی ہے جن کے لیے یہ ملک قائم کیا گیا تھا' جس کا خواب اقبال اور قائداعظم نے دیکھا تھا اور جس خواب کی تعبیر دیکھنے کے لیے پوری ملت اسلامیہ پاک و ہند نے ایک عظیم جدوجہد کی تھی۔ قائد نے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ پاکستان کو پوری دنیا میں ایک تاریخی کردار ادا کرنا ہے' پاکستان ملتِ اسلامیہ کا حصہ اور عالم اسلام کے احیا کا نقیب ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ پاکستان محض ایک علاقے کا نام نہیں' ایک نظریے کا علم بردار ہے جو اسلام کے نظام عدل و انصاف سے عبارت ہے اور جس کی بنیاد قرآن و سنت اور اسوۂ رسولؐ پر ہے جس میں اسلامی حدود کے اندر عوام کی حکمرانی' پارلیمانی نظام کا فروغ' حقوق انسانی کی پاس داری' معاشی عدل اور خوش حالی اور انتظامی اور فوجی خدمت کا سول حکمرانی کے تابع ہونا شامل ہے۔ یہ ہے مستقبل کے بارے میں ہمارا وژن۔

وقت کی اصل ضرورت یہ ہے کہ اس وژن کو عوام تک پہنچایا جائے' سیاسی عمل کے ذریعے ایک ایسی قیادت کو اسمبلیوں تک پہنچایا جائے جو اس وژن کی امین اور اس کو بروے کار لانے کی صلاحیت سے آراستہ ہو اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر مخالف قوت کا مقابلہ کر سکے۔ جو امریکہ اور بھارت کے لیے نرم نوالہ نہ بنے اور لچک کے نام پر کسی اصول کی قربانی اور کسی مورچے سے پسپائی کی اجازت نہ دے' جو ملک کی دولت اور وسائل کو امانت سمجھے اور عوام کی خدمت اور ملک کی قوت کی تعمیر کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دے۔ عوام میں یہ صلاحیت موجود ہے۔ قوم بانجھ نہیں ہوگئی۔ اس میں اچھے لوگوں کی بڑی تعداد ہے جن کو منظم اور متحرک کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ملک کو بیرونی خطرات اور اپنوں کی چیرہ دستیوں سے بچایا جا سکے اور جو خواب اس قوم نے دیکھا تھا اسے حقیقت کے روپ میں دیکھا اور دکھایا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے جدوجہد اور قربانی وقت کی ضرورت ہے اور اس جدوجہد کو---'یا تن رسد بہ جاناں' یا 'جاں زتن برآید' کے جذبہ کے برپا کرتے ہی ہم ملک کی حفاظت اور ملت کو اس کی منزل کی طرف سرگرم کر سکتے ہیں۔

دستوری ترامیم کی لڑائی بھی اب پارلیمنٹ میں لڑی جائے گی اور جنرل صاحب پارلیمنٹ کی تائید کے بغیر نہ اپنے تین سال کے اقدامات کے لیے تحفظ حاصل کر سکتے ہیں اور نہ آیندہ کے لیے کسی نقشے میں رنگ بھر سکتے ہیں۔ اس وقت کوئی ایسا اقدام نہیں ہونا چاہیے جو انتخابات کو موخر کرنے یا ہائی جیک کرنے کا کسی کو موقع دے۔ متحدہ مجلس عمل نے اس سلسلے میں بڑی دانش مندی سے حکمت عملی بنائی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو وسعت دی جائے اور قوم کے تمام اچھے عناصر کو ایک پلیٹ فارم پر لاکر اور باہم افہام و تفہیم کے ذریعے تصادم اور ووٹوں کی تقسیم سے بچا کر ایک ایسی سیاسی قیادت کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور دی جائے جو عوام میں سے ہو' عوام کی سچی خادم ہو' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی وفادار ہو' امین اور صاحب کردار ہو اور قوم اور ملک کو ایک شان دار مستقبل کی طرف لے جانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ یہ ایک قابل حصول ہدف ہے بشرطیکہ ہم سب ذاتی اغراض اور گروہی تعصبات سے بالا ہوں' ایک مشترک مقصد کے حصول کے لیے سرگرم ہو جائیں' حالات کے خاموش تماشائی نہ بنے رہیں' اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہماری قسمت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے لیے عمل اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اب بھی نہ اٹھے تو پھر اٹھ کھڑے ہونے کے مواقع سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ آج کا پیغام یہی ہے کہ ؏

یہ گھڑی محشر کی ہے' تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

(اس مقالے کا کتابچہ دستیاب ہے۔ قیمت: ۶ روپے۔ منشورات' منصورہ' لاہور)

اطاعت، خشیت، تقویٰ

حضرت عمر فاروقؓ ایک روز مسجد نبویؐ میں کھڑے تھے اچانک ایک رومی دہقانی بالکل آپ کے برابر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: انا اشهد ان لا اله اِلَّا اللّٰه واشهد ان محمدًا رسول اللّٰه۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے پوچھا: کیا بات ہے؟

اس نے کہا: میں اللہ کے لیے مسلمان ہو گیا ہوں۔

حضرت عمرؓ نے پوچھا: کیا اس کا کوئی سبب ہے؟

اس نے کہا: ہاں! بات یہ ہے کہ میں نے توراۃ، انجیل، زبور اور انبیاء سابقین کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں مگر حال میں ایک مسلمان قیدی قرآن کی ایک آیت پڑھ رہا تھا۔ وہ سنی تو معلوم ہوا کہ ایک چھوٹی سی آیت نے تمام کتب قدیمہ کو اپنے اندر سمو لیا ہے تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ وہ کون سی آیت ہے؟ تو رومی دہقان نے آیت: وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ○ (نور ۲۴:۵۲) تلاوت کی اور اس کے ساتھ اس کی تفسیر بھی عجیب وغریب اس طرح بیان کی کہ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ فرائض الٰہیہ کے متعلق ہے، وَرَسُوْلَهٗ سنت نبویؐ کے متعلق ہے، وَيَخْشَ اللّٰهَ گذشتہ عمر کے متعلق ہے، وَيَتَّقْهِ آیندہ باقی عمر کے متعلق ہے۔ جب انسان ان چار چیزوں کا عامل ہو جائے تو اس کو اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ کی بشارت ہے، اور فائز وہ شخص ہے جو جہنم سے نجات پائے اور جنت میں اس کو ٹھکانہ ملے۔

حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں اس کی تصدیق موجود ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہے: اُوْتِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسے جامع کلمات عطا فرمائے ہیں جن کے الفاظ مختصر اور معانی وسیع ہیں۔ (تفسیر قرطبی)

(خیر خواہ)

فرض آپ کو پکار رہا ہے......!

الشیخ سلمان العودہ

ترجمہ: ڈاکٹر ظہیر عمر شیخ

آخر اُمت مسلمہ کا فرض منصبی اور مقصد وجود کیا ہے؟

یہ ایک ایسا کامیاب و کامران، جدوجہد کرنے والا گروہ ہے جو نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے...... پس اوّل مرحلے پر، جو افراد باصلاحیت ہیں، اور اس منصب کی ادائیگی کے لیے طاقت بھی رکھتے ہیں، وہ اس فرض کی ادائیگی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ صلاحیتوں سے مالا مال وہ نوجوان جو عقل وفہم سے آراستہ ہو، جس کا حافظہ بلا کا ہو، جو دعوت الی اللہ اور اصلاح اُمت کے لیے گفتگو کا سلیقہ اور خطابت کا فن جانتا ہو، حکمت دعوت کا فہم رکھتا ہو، معاشرے میں اثر ورسوخ کا حامل ہو، اور اسے دیگر وسائل اور مواقع بھی میسر ہوں، تو اسے چاہیے کہ ذاتی آسایش، سہل پسندی اور دنیوی منفعتوں کی پروا کیے بغیر میدان کارزار میں کود پڑے کہ یہ میدان اپنے شہ سواروں کا بے چینی سے منتظر ہے!

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو بھی نعمتیں عطا کی ہیں وہ ان سب کے بارے میں روز قیامت جواب دہ ہے لیکن اُلجھن یہ ہے کہ وہ مال و دولت کو تو رزق سمجھتا ہے اور اس کے بارے میں کسی حد تک جواب دہی کا احساس بھی رکھتا ہے حالانکہ وہ تمام صلاحیتیں اور جسمانی قوتیں جو اسے خدا کی طرف سے عطا کی گئی ہیں، ان کے بارے میں بھی وہ اسی طرح مسئول ہے۔ ہم میں سے کتنے انسان ایسے ہیں جو رب کی عطا کردہ ذہنی صلاحیتوں اور دیگر قوتوں کو حق کی نصرت اور اس کے دفاع کے لیے استعمال کرنے کا شعور وادراک رکھتے ہیں؟ کتنے انسان ایسے ہیں جو اپنی فصاحت و بلاغت کو دعوت الی اللہ کے لیے اور اعداے دین کی رسوائی کے لیے استعمال کرتے ہیں؟ پھر ایک بڑی تعداد اس غلط فہمی کا شکار ہے، یہ گمان رکھتی ہے اور اس کا یہ دعویٰ ہے کہ روز محشر سب کی باز پرس یکساں ہوگی خواہ غنی وفقیر ہو یا دولت منداور تنگ دست، ایک فصیح اللسان مقرر ہو یا ایک لکنت زدہ شخص، ایک ذہین وفطین، باصلاحیت اور زرخیز ذہن ہو یا ایک کند ذہن اور غبی، ایک صحت مند و توانا

فرد ہو یا ایک کمزور اور لاغر شخص، ایک متوازن الاعضا ہو یا اور ایک معذور ومحتاج، ایک باشعور ہو یا ایک بے شعور، ایک وسائل کا حامل ہو یا ایک وسائل سے محروم --- ایسے سب انسانوں کو اس آیت کا مطالعہ کرنا چاہیے:

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰكُمْ ط اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ز وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (الانعام ۶:۱۶۵)

وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمھاری آزمایش کرے۔ بے شک تمھارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔

اس آیت میں حیرت انگیز تسلسل پایا جاتا ہے اور بہت سے حقائق پوشیدہ ہیں جو غور طلب ہیں۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے، اور یہ اس لیے ہے تاکہ وہ یہ جانچ سکے کہ دنیا میں اس کی کارگزاری کیا رہی۔ دنیا میں رہنے کا اصلی مقصد ہی آزمایش ہے اور اس ذمہ داری میں تمام انسان یکساں شریک ہیں۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند مراتب و درجات دیے ہیں۔ اس درجہ بندی میں اختلاف وتنوع پایا جاتا ہے۔ وہ رزق کی تقسیم ہو یا جسمانی ساخت کا معاملہ، عقل و دانائی ہو یا مختلف صلاحیتیں اور اوصاف، یا انسانی معاشرے میں فراہم کردہ مختلف مواقع، وسائل یا ذمہ داریاں ومنصب، تمام ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ سب کچھ دراصل اللہ تعالیٰ کے نظام میں جاری سنت کے مطابق ہے:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ط وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ○ (الزخرف ۴۳:۳۲)

دنیا کی زندگی میں ان کی گزر بسر کے ذرائع تو ہم نے اِن کے درمیان تقسیم کیے ہیں، اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں اور تیرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو (ان کے رئیس) سمیٹ رہے ہیں۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے اس میں انسان کی آزمایش کرے۔ یہ

درجہ بندی اسی لیے ہے کہ اُن تمام ظاہری و پوشیدہ نعمتوں کے بارے میں جو اس نے انھیں عطا کی ہیں انسانوں کی جانچ اور پرکھ ہو......اب کیا تم ان نعمتوں، وسائل اور صلاحیتوں کو اسلام کی بالادستی کے لیے کھپا کر حقیقی کامیابی سے ہم کنار ہونا چاہتے ہو یا ان کو محض بے فائدہ مصرف میں لاکر، ضائع کر کے اپنے خلاف حجت قائم کرنا اور اُمت مسلمہ کے ضعف و کمزوری کا سبب بنا چاہتے ہو!

چوتھی حقیقت یہ ہے کہ بے شک تمھارا رب سزا دینے میں بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے، یعنی جس شخص نے اپنے رب کی عطا کردہ نعمتوں کے باوجود معصیت و نافرمانی اور رسولوں کی تکذیب کی راہ اختیار کی تو عذاب الٰہی دنیا و آخرت میں اس کا مقدر ہے۔ اگر ان صلاحیتوں کو اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے استعمال کیا تو اس راہ کے اندر جو غلطیاں یا کمی بیشی ہوگی تو وہ نہ صرف اس کو معاف کر دے گا بلکہ اجر و ثواب کا سزاوار بھی ٹھیرائے گا۔ کیونکہ وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

افسوس صد افسوس ایسے لوگوں پر جنھوں نے اپنی قیمتی ذہنی صلاحیتوں اور زرخیز ذہن کو فضول مطالعے اور لغو کاموں میں ضائع کر دیا، جو دنیا و آخرت کے لحاظ سے سراسر گھاٹے کا سودا ہے...... کتنے زیادہ ہیں یہ لوگ......افسوس!

کس قدر خسارے کا سودا کیا ہے ان لوگوں نے جن کو اللہ تعالیٰ نے گفتار و بیان کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا مگر انھوں نے اپنا سارا وقت لغو اور فضول کلام سننے اور سنانے میں گنوا دیا---حسرت ہے اللہ کے ان بندوں پر!!

دل یاس و حزن سے بھر جاتا ہے اور کتنی مرتبہ دل کو کچوکے لگتے ہیں یہ دیکھ کر کہ باصلاحیت اور اہل نیکوکار لوگوں میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جنھیں شیطان بہکا کر لے گیا اور انھیں اپنی ذمہ داریوں سے غافل کر دیا ہے۔ وہ لوگ جن کے بارے میں امید تھی کہ وہ اُٹھ کھڑے ہوں گے، تحریک کا ہراول دستہ بنیں گے، اس کے لیے تن من دھن اپنا سب کچھ وار دیں گے اور قافلۂ راہِ حق کو ایک نیا عزم، نیا حوصلہ اور ایک ولولہ تازہ ملے گا، انھوں نے تو گوشہ نشینی اختیار کر لی اور تحریک اور دعوت سے ایسے لاتعلق ہو کر رہ گئے کہ جیسے ان کا کبھی اس سے کوئی ناطہ ہی نہ تھا۔ کبھی تو شیطان نے انھیں جاہ و منصب سے دُور رہنے کا درس دیا، اور کبھی شہرت و ناموس سے ہٹ کر کسی کونے میں بیٹھ جانے کا سبق پڑھایا، اور کبھی اس راہ میں ریاکاری کا خوف دلایا۔ کبھی یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گئے کہ مجھ ناتواں کی صلاحیتیں واجبی سی ہیں، میرے مقابلے میں دوسرے اہل افراد موجود ہیں۔ ایسے میں میرے الگ بیٹھ رہنے یا لاتعلق ہو جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر آپ انھیں سمجھانے کی کوشش کریں، نہایت دل سوزی و ہمدردی سے اصل حقیقت باور کرائیں تو ان کی طرف سے یہ جواب ہوگا کہ

حضرت! یہ درست ہے کہ حالات ساز گار نہیں' مردان کار کی کمی ہے اور اسلام کے محض خالی دعوے دار' غیر تربیت یافتہ اور اسلامی فکر سے عاری افراد آگے آ گئے ہیں' ایسے میں بااصول' باکردار اور تربیت یافتہ افراد کے لوگ منتظر ہیں۔ یہ میدان خالی پڑا ہے۔کل سے زیادہ آج پیاس' طلب اور تڑپ پائی جاتی ہے---لیکن ہم جیسے کمزور اور ناکارہ لوگوں سے یہ کام کہاں ہو سکے گا' ہمیں تو آپ رہنے ہی دیجیے! اس راہ میں بہت سی رکاوٹیں بھی ہیں' خدا سے بہتری کی دعا کیجیے!

سبحان اللہ! کیا منطق اور استدلال ہے--- حالات کی سنگینی کا اندازہ بھی ہے لیکن پھر بھی میدان کھلا چھوڑ رکھا ہے! اے بندۂ خدا! دعوت وتبلیغ اور اقامت دین کا یہ میدان آخر کس کے لیے کھلا چھوڑ رکھا ہے؟ آخر کون اس فریضے کی ادایگی کے لیے آگے بڑھے گا؟ کسے ان رکاوٹوں کو پاٹنا ہے؟ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ یہ کام اب تم پر فرض ہو چکا ہے۔ یہ فرض عین ہے۔ وقت کا تقاضا کیا ہے--- یہی کہ اگر تم اپنے اندر اس کام کے لیے کسی پہلو سے بھی کوئی صلاحیت پاتے ہو تو آغاز کار کے لیے فضول قسم کی تاویلات کا سہارا ترک کردو۔ کیا تم اپنی نمازوں میں یہ دعا نہیں پڑھتے' اور اپنے رب کو ان الفاظ کے ساتھ نہیں پکارتے ہو؟

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ○ (الفرقان ۲۵:۷۴)

اے ہمارے رب' ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیز گاروں کا امام بنا۔

کیا یہ مناسب ہے کہ تمھارا عمل' تمھارے دعوے اور تمھاری دعا کے خلاف ہو۔

اسوۂ نبیؐ کو دیکھو! آپؐ نے ہمیں مقاصد کے حصول کے لیے پہلے تمام ممکنہ وسائل و ذرائع اختیار کرنے کی ہدایت دی ہے اور پھر ان مقاصد کی کامیابی کے لیے دعا کی تعلیم فرمائی ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ مکرمہ پر فوج کشی کی تو مدینہ منورہ کے تمام آنے جانے والے راستوں پر پہرہ داری کا نظام وضع کیا تاکہ حملے کی تیاری کی خبر کفار کو نہ ہو سکے۔ اس ضمن میں جو کچھ بھی ہو سکا وہ کیا' تمام ممکنہ مادی وسائل بروے کار لائے گئے اور اس کے بعد بارگاہ الٰہی کی طرف متوجہ ہوئے اور دعا مانگی: اے اللہ! قریش کو ہماری جنگی تیاریوں کی خبر سے غافل کر۔

حضرت عمر فاروقؓ کا اس سلسلے میں کیا طرزِ عمل تھا؟ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کچھ بیمار اُونٹ دیکھے تو ان کے مالکوں سے پوچھا کہ تم ان کے علاج کے لیے کیا کرتے ہو؟ انھوں نے جواباً کہا کہ ہمارے پاس ایک صالحہ عورت ہے۔ ہم اس کے پاس دعا کے لیے جاتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ اس بوڑھی کی دعا کے ساتھ دوا بھی

شامل کرلو (یعنی آپ نے وسائل اکٹھا کرنے کی تعلیم دی)۔ دعا تو وسائل کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے مانگی جاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ آج غلبہ دین' اقامت دین اور دعوت الی اللہ جیسے اہم فریضے کی ادائگی کے لیے ہمیں بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ فہم دین' علمی استعداد' افکار و نظریات کے حامل باکردار' باصلاحیت اور تربیت یافتہ افراد اور فدایانہ جذبے سے اس مشن کو لے کر چلنے والے اور دعوت کے عمل کو آگے بڑھانے والے لوگوں کی کمی کا سامنا ہے۔ حالات کی سنگینی اپنی جگہ ہے۔ اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ اسلام کے محض خالی دعوے دار ایک بڑی تعداد میں آگے آگئے ہیں۔ نااہل اور مفاد پرست افراد جنھیں محض نام و نمود اور اپنا مفاد عزیز ہے اقتدار پر مسلط ہیں اور ملک و ملّت کے مفاد کے خلاف اور اسلام دشمن قوتوں کے مفادات کی تکمیل کے لیے کوئی بھی سنگین اقدام اٹھانے میں انھیں کوئی باک یا جھجک نہیں--- ایسے میں کیا عجب تقویٰ ہے جو گھر بیٹھ جانے کی تعلیم دے!

کیا یہی تقویٰ ہے کہ فرض عین جیسے فریضے کی تکمیل سے دست کش ہوا جائے اور اس اہم ذمہ داری کی ادائگی سے اعراض برتا جائے؟ خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں اور وسائل کو اس راہ میں کھپانے سے احتراز کیا جائے؟

یہ مشورہ تو ضرور دیا جائے کہ علم کی شمع روشن کی جائے' دعوت کا عمل عام کیا جائے' خطابت کے جوہر دکھائے جائیں' لیکن خود اس خوف سے دُور رہا جائے کہ کہیں ان میں سے کوئی ذمہ داری مجھ پر عائد نہ ہو جائے؟ کیا گوشہ نشینی کا زمانہ آچکا ہے کہ ہم تقویٰ کے معنی ''ہر کام سے فرار'' کے اندر تلاش کریں؟ یہ شکوہ کہ معیار متاثر ہوگیا ہے' تربیت اور کردار سازی میں کمی ہے' حکمت عملی اور تدبیر کا فرق ہے' گو معروف کے دائرے ہی میں ہو--- حالانکہ یہ صرف موہوم اندیشے ہیں' اور اگر حقائق بھی ہوں تو کیا حقائق کا سامنا کرنے کی ضرورت ہے یا راہِ فرار اختیار کرنے کی!!

حالات کی سنگینی کا تقاضا آگے بڑھنا ہے' اصلاح احوال کے لیے' بگاڑ کے سدباب کے لیے' خیر کو سمیٹنے اور صالح عنصر کو منظم کرنے کے لیے اور بدی کے خلاف منظم جدوجہد کرنے کے لیے--- یہ وقت بیٹھ رہنے یا انتظار کا نہیں ہے--- جو کچھ کر سکتے ہیں کر گزریے! اللہ نے جو کچھ آپ کو عطا کیا ہے' وسائل اور صلاحیتوں سے نوازا ہے' اس کی راہ میں کھپا دیجیے--- اس لیے کہ اس کی جواب دہی ہے' یہی کامیابی اور نجات کی راہ ہے۔

آگے بڑھیے--- فرض آپ کو پکار رہا ہے!!

ربنا وجعلنا للمتقين اماما!

33

وقت

اللہ تعالیٰ وقت کا خالق ہے۔ زمانے اور تاریخ کے سارے اُلٹ پھیر اور اس کی حدود میں واقعات اور حالات کی ظہور پذیری کا سلسلہ منشائے الٰہی سے ممکن ہے۔ اس کی اپنی ذات' وقت کے نظام اور اس کی خصوصیات سے مبرا ہے۔ وہ وقت کے آغاز سے پہلے موجود تھا' اور وقت کی مختلف نوعیت کی حالتوں کے اختتام کے بعد بھی موجود رہے گا۔ وقت اور مادہ دونوں ایک ہی نوعیت کی خصوصیات والی اشیا ہیں۔ وقت گزرنے کی مثال برف پگھلنے سے دی جاتی ہے۔ دونوں کو ہی بقا نہیں۔

وقت کی پیمائش مختلف حوالوں سے کی جاتی ہے۔ ان سب کا احاطہ کرنے سے وقت کا تصور واضح ہو جاتا ہے۔

عمر	:	انسانی زندگی کو ناپا جاتا ہے' پیدائش کے بعد مخصوص وقت کا عرصہ۔
مہ و سال	:	دنیا کی عمر کو ناپا جاتا ہے' تخلیق کے بعد گزرنے والے وقت کا عرصہ۔
زمانہ	:	حالات کی منفرد خصوصیات کی بنیاد پر وقت کی میعاد قائم کی جاتی ہے' جدید و قدیم' قبل مسیح و بعد مسیح' ہجری و قبل ہجری' سائنسی و زرعی دور وغیرہ کے عنوانات سے زمانے کی تقسیم۔
موسم	:	سال کے دوران درجہ حرارت کی دیرپا تبدیلی اور زمین کی گردش کی بنیاد پر تقسیم' ہر موسم میں زمین میں جو نمایاں تبدیلیاں آتی ہیں ان کی پہچان۔
گھڑی کا وقت	:	قدرت نے درختوں میں' پہاڑ کی پرتوں میں' زمین کی تہوں میں' برفانی تودوں کی سرنگوں میں گھڑی کا سائنسی نظام نصب کیا ہے جو نہ صرف وقت بلکہ جو کچھ بیت چکا ہے اس کا ریکارڈ محفوظ رکھنے کے قابل ہے۔ انسانی گھڑی وقت کے بہاؤ کے ساتھ چلتی ہے اور اس کے گزرنے کا پتا دیتی ہے' ریکارڈ نہیں رکھتی۔ لمحات کی پیمائش گھڑی اور کیلنڈر سے ممکن ہے۔
مرضی کا وقت	:	اپنی مرضی سے کسی لمحے کو نقطۂ آغاز بنا کر وقت کی پیمائش۔
حالات و واقعات	:	مختلف بڑے ایام' مثلاً عید و رمضان اور حج' مختلف حادثات و واقعات' کائنات میں ظہور پذیر تبدیلیوں کے حوالے سے وقت کی پیمائش۔
تاریخ	:	انسانی زندگی کی انفرادی و اجتماعی سرگرمیوں کی روداد کے ذریعے سے وقت کی تعبیر اور اس کی مختلف حدود کا تعین۔
آخرت	:	دنیاوی وقت کے اختتام کے بعد نئے سلسلۂ وقت کا آغاز جو ہمیشہ جاری رہے گا۔

قانونِ فطرت اور قوموں کا عروج

طلعت منظور احمد

کسی قوم اور ملک کے لیے نظام وضع کرتے وقت سب سے پہلے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ جن لوگوں کے لیے نظام وضع کیا جا رہا ہے اُن کا طرز زندگی کیا ہے؟ وہ کس قسم کی حکومت اور کیسے حکمران چاہتے ہیں؟ کون سی فکر اُن پر غالب ہے؟ وہ کس نظام کے تحت زندگی گزارنا چاہتے ہیں؟ کون سے فلسفۂ زندگی پر وہ ایمان رکھتے ہیں؟ کس اخلاقی معیار کو وہ سند مانتے ہیں' اور کون سی معاشرتی قدروں کو پروان چڑھا کر معاشرے کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں' اور کس نظریاتی اور فکری اساس پر اپنے نظام کا ڈھانچا استوار کرنا چاہتے ہیں؟ کسی بھی نظام کا خاکہ تیار کرتے وقت اِن تمام حقائق کو لازماً ملحوظِ خاطر رکھنا ہوگا۔ اس سے انحراف کر کے اُن کے لیے ایسا نظام ترتیب دینا جو اُن کے فلسفۂ زندگی' اُن کے ایمان کے تقاضوں اور معاشرتی اور اخلاقی قدروں سے متصادم ہو' کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔

لوگوں کا پختہ ایمان جب ایک نظامِ زندگی پر ہو اور وہ اس سے انحراف کے لیے ہرگز تیار نہ ہوں لیکن وہ زندگی بالکل ایک دوسرے نظام کے تحت گزار رہے ہوں تو فکر و عمل کے اس متضاد رویے سے بے شمار تضادات جنم لیتے ہیں' جب کہ ''قانونِ فطرت'' عقیدے اور عمل کے اس متضاد رویے کو ہرگز قبول نہیں کرتا۔ لہٰذا ایسی قومیں اور معاشرے ''منافقت'' جیسی قبیح اور لاعلاج بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس سے جھوٹ' مکر و فریب' دغابازی' خیانت اور وعدہ خلافی جیسی قبیح خصائل قومی زندگی کا ایک لازمی حصہ بن جاتے ہیں۔ اس سے اِن کی ذہنی سوچ بھی غیر متوازن ہو جاتی ہے۔ ایسی قوموں میں عدل و انصاف خاص طور پر قابل خرید و فروخت جنس بن کر رہ جاتا ہے۔

زندگی میں منافقانہ رویے چونکہ انسان کے اندر قابل قدر حقیقی جذبات کو پنپنے نہیں دیتے' اس لیے یہ رویے انسان کے سچے جذبات اور آرزوؤں کو کچل کر ذہنی بالیدگی کو روک دیتے ہیں اور فکری اور ذہنی انتشار کو فروغ دینے کا باعث بنتے ہیں۔ اس سے علم و دانش کا دم گھٹ جاتا ہے' تحقیق و جستجو ختم ہو جاتی ہے' ایجاد و اختراع

کا راستہ بند ہو جاتا ہے‘ عدم برداشت اور متشدد رویے اُبھرنے لگتے ہیں۔

دنیا میں قوموں کی ترقی کا راز کسی ایک مخصوص نظام سے وابستہ نہیں۔ نظام چاہے کوئی بھی ہو اصل چیز اس نظام کا قوم اور معاشرے کی نظریاتی اساس یا فکری بنیاد کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ہے۔ یہ نظام سیکولر ہو یا اس کی بنیاد کسی مذہب کے قوانین وافکار پر ہو‘ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ مذہب ہندومت‘ یہودیت‘ عیسائیت‘ اسلام یا کوئی بھی مذہب ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی قوم سیکولر فکر کی حامل ہے اور اس کے مطابق اپنے نظام کو ترتیب دے کر کمال ایمان داری اور یکسوئی کے ساتھ اِس کو اپنا آئیڈیل بنا کر اس پر عمل پیرا ہو جاتی ہے‘ اور پوری دیانت کے ساتھ اس کو اپنی فلاح اور ترقی کا ذریعہ سمجھتی ہے تو گویا یہ قوم اس نظام کو ایک طرح سے اپنا عقیدہ بنا لیتی ہے۔ اس طرح یہ قوم اور معاشرہ ہر قسم کے ذہنی خلجان اور انتشار سے بچ جاتا ہے اور کسی کج روی کا شکار نہیں ہوتا اور ’’منافقت‘‘ جیسی قبیح بیماری سے اپنے آپ کو بچا لیتا ہے کیونکہ اس کے فکروعمل میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔ یہ نظام قوم کے لیے ایک تقدس کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس کا عقیدہ‘ اس کے معاشرتی تقاضے‘ قومی ضرورتیں اور مادی حاجات ہم آہنگ ہو جاتے ہیں‘ اور قوم یکسوئی فکروعمل کی وجہ سے تیز رفتاری کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن ہو جاتی ہے۔ خدا بھی اپنی مشیت کے تحت‘ انسان کے حالت امتحان میں ہونے اور اختیار کی آزادی) کے تحت اس کو اس راہ میں آگے بڑھنے کا موقع اس وقت تک دیتا ہے جب تک وہ انتظامِ دنیا میں کسی بڑے بگاڑ‘ فساد‘ بدنظمی یا ظلم وستم کا باعث نہ بنے۔ خدا کے اس قانون میں مسلم اور غیرمسلم کی تمیز روا نہیں رکھی جاتی۔

فطری رہنمائی جبلی طور پر ہر جان دار مخلوق کو ودیعت کی گئی ہے۔ انسان چونکہ ایک کامل ذی شعور مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُسے زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے‘ اس لیے اُسے قانون فطرت کے علاوہ ’’احکامات خداوندی‘‘ پر عمل کے قانون کا بھی پابند کیا گیا ہے۔ یہ انسان کو انبیا اور مرسلین کی وساطت سے وحی کے ذریعے دیا گیا ہے۔ قانونِ فطرت کے نتائج کا تعلق صرف اس دنیوی زندگی سے ہے‘ جب کہ احکاماتِ خداوندی پر عمل کے نتائج کا تعلق دنیا و آخرت دونوں کے ساتھ یکساں ہے۔ اکیلے قانون فطرت پر عمل کرنے والی قوم کے ساتھ تائیدِ ایزدی کا کوئی وعدہ نہیں‘ جب کہ احکاماتِ خداوندی پر عمل کرنے والی قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی جیسی عظیم نعمت کی خوشخبری ہے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد کے ذریعے نہ صرف ترقی‘ بلکہ حقیقی عروج اور دنیا پر غلبے کا وعدہ بھی کیا ہے‘ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔ آخرت کا بے کراں اجر اس کے علاوہ ہے۔

یہ کوئی فلسفہ طرازی نہیں بلکہ عین قانون فطرت ہے کہ فحاشی اور بے حیائی کے مظاہر اور انکارِ خداوندی کے باوجود وہ قومیں ایک خاص عرصے تک زندہ رہ سکتی ہیں جو اپنے باطل عقیدے سے مخلص ہوں‘ اس کے نفاذ

کے لیے بھرپور جدوجہد کرنے اور دنیا میں کسی بڑے فساد اور بگاڑ کا باعث نہ بنیں۔ دوسری طرف خدا پر کامل ایمان اور اس کی ظاہری رسومِ عبودیت کے باوجود کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی اگر اس کا زندگی میں رویہ منافقانہ ہو اور عدل و انصاف سے انحراف کی روش پر قائم ہو۔ یہ اٹل قانونِ خداوندی ہے جسے کوئی تبدیل نہیں کرسکتا۔

اب ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ دنیا میں اس وقت ایسی کون سی قومیں ہیں جو اپنے ایمان، عقیدے اور مذہب کی بنیاد پر کوئی ٹھوس نظریۂ حیات رکھتی ہیں۔ یہودیت اور عیسائیت الہامی مذاہب ہونے کے باوجود اپنی دینی اساس کو بڑی حد تک چھوڑ چکے ہیں اور گمراہی کا شکار ہیں۔ یہودی اپنی یہودیت میں گم ہیں، جب کہ عیسائیت میں مذہب محض شناخت کے لیے ہے اور شناخت بھی دوسری۔ ان کی پہلی شناخت وطنی قومیت ہے۔ بودھ مت، ہندومت اور شنٹوازم وغیرہ اس وقت محض اوہام پر قائم ہیں۔ اُن کے ہاں مذہب محض کبھی کبھار پوجاپاٹ کا نام ہے۔ یہ تمام مذاہب اپنے ماننے والوں کو ان کی اجتماعی زندگی کے لیے کوئی قوانین اور احکامات نہیں دیتے۔ اگر کوئی ایسے قوانین و احکامات ہیں بھی تو اس کے ماننے والے انھیں قابلِ عمل نہیں سمجھتے اور وہ انھیں اپنی عملی زندگی سے خارج کر چکے ہیں اور انھوں نے قانون دہندہ کی حیثیت سے اپنے مذہب اور عقائد سے دست برداری اختیار کرلی ہے۔ اس لیے اب یہ تمام مذاہب ہمارے زیربحث نہیں رہے کیونکہ اُن کے پاس عقیدے کی بنیاد پر کوئی فکری اساس نہیں۔ اب وہ جو نظام بھی اختیار کریں اس میں منافقت کا کوئی پہلو نہیں ہوگا کیونکہ اُن کا یہ نظام ہی اُن کا عقیدہ ہوگا۔ البتہ مسلمانوں کا معاملہ اس سے قطعی مختلف ہے۔ روزِاول سے لے کر آج تک ان کا دین زندہ و تابندہ اور متحرک ہے۔ اس میں آج تک نہ کوئی اضافہ کیا گیا ہے اور نہ اِس کے کسی اصول کو دقیانوسی ہی قرار دے کر چھوڑا گیا ہے۔ یہ اپنی تمام جزئیات کے ساتھ اپنے ماننے والوں کے دل و دماغ میں تروتازہ اور پوری قوت کے ساتھ ان پر حاوی ہے۔ اس کے ماننے والوں کی عظیم اکثریت اس بات پر پختہ ایمان رکھتی ہے کہ ان کا دین قوانین و ضوابط اور احکامات کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے ایک اجتماعی ضابطۂ حیات کی ٹھوس بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں پر کسی ایسے نظام کو مسلط کرنے کی کوشش کرنا جس کی بنیاد اسلام نہ ہو، حقائق سے آنکھیں بند کرنا اور ایک غیر دانش مندانہ اقدام ہوگا۔ اس کا عملی نفاذ ایک لاحاصل کوشش، بےثمر جدوجہد اور قوم کو زوال کی طرف دھکیلنے کی ایک ملک دشمن کوشش ہوگی۔

ہر مسلمان کا یہ ایمان ہے کہ دین کی جزئیات تک پر عمل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ کوئی مسلمان چاہے عمل میں کوتاہی کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو، ایمان کی حد تک وہ باعمل مسلمان ہی کی طرح ہے۔ مسلم معاشرے میں مساجد کا بڑی تعداد میں پایا جانا، اذان کی صدا پر لبیک کہنا، جمعۃ المبارک کے روز نماز کا خصوصی اہتمام، مدارس دینیہ کا قیام اور ہزاروں طلبہ کا علوم دین سیکھنا، قرآن سیکھنا اور تلاوت کے ساتھ حفظ قرآن کا خصوصی اہتمام اور

حفاظ کا بڑی تعداد میں پایا جانا' اسلامی تعلیمات پر ایمان رکھنا' ان شاء اللہ' ماشاء اللہ' بسم اللہ' لاحول ولاقوۃ وغیرہ جیسے الفاظ کا عام استعمال--- اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام ان کی فطرت کا حصہ ہے۔ یہاں تک کہ کوئی مسلمان قبلہ رُخ ہو کر پیشاب نہیں کرتا اور قبلہ رُخ ٹانگیں پھیلا کر کسی صورت میں نہیں سوتا۔ قرآن پاک کو کسی نیچی جگہ پر رکھنا تو دُور کی بات ہے اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنا بھی ایک مسلمان گناہ سمجھتا ہے۔ اگر کوئی عربی تحریر گری پڑی مل جائے تو ایک مسلمان یہ سمجھ کر اٹھا لے گا کہ شاید یہ قرآنی آیت ہو چاہے حقیقت میں وہ کوئی اشتہار ہی کیوں نہ ہو۔ ایک مسلمان چاہے قرآن پاک کے مندرجات کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو لیکن اُس کا اس بات پر پختہ ایمان ہے کہ قرآنِ پاک ہی اصل ہدایت اور کامیابی و نجات کی راہ ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے جب بھی بڑے پیمانے پر قربانیاں دیں اور سر دھڑ کی بازی لگائی تو وہ بھی دین کی خاطر ہی لگائی ہے۔ صرف اس حوالے سے ہی ایک عام مسلمان کی اسلام کے بارے میں سوچ اور والہانہ وابستگی اور قرآن پاک سے شدید عقیدت کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔

یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ ساری دنیا میں مغربی جمہوری نظام کامیابی سے چل رہا ہے' آخر یہ مسلمان ممالک ہی میں ناکام کیوں ہے؟ مغلوب ذہنوں کے فہم و ادراک سے عاری مقتدر لوگ اس پر غور و فکر کے لیے تیار ہی نہیں۔ اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اس کا کوئی تقدس نہیں اور جس نظام کا تقدس دلوں میں نہ ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ برطانیہ میں انجیل مقدس کو زمین پر رکھا جا سکتا ہے لیکن قومی پرچم کی اس طرح توہین نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ اُن کے ہاں اس نظام کا نشان ہے جس نظام کو اُن کے ہاں تقدس کا درجہ حاصل ہے۔ بچے قومی پرچم کو لہراتا دیکھ کر اس کی تکریم اور احترام کی وجہ سے سینے پر انگلی سے صلیب کا نشان بناتے ہیں۔ پوری قوم کے دلوں میں تقدس کی بنا پر یہ دنیا کا کامیاب ترین نظام ہے۔ اگر مسلمان بھی یہودیوں' عیسائیوں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کی طرح اپنے دین سے دست بردار ہو جائیں تو سیکولر نظام اُن کے ہاں بھی اسی طرح کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ کیا مسلمان ایسا کریں گے؟--- دست برداری تو دُور کی بات ہے مسلمانوں کی عظیم اکثریت تو اس کے متعلق سوچنا بھی گناہ سمجھتی ہے۔

بعض دانش ور کہتے ہیں کہ سیکولرازم کا مطلب مذہب مخالفت نہیں۔ اِن کی یہ بات دانش ورانہ دیانت کے خلاف ہے۔ سیکولرازم میں جب ایسے کاموں کی قانونی اجازت دی جاتی ہے بلکہ انھیں قانونی تحفظ بھی فراہم کیا جاتا ہے اور اُن کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے جنھیں مذہب سختی سے منع کرتا ہے اور اُنھیں حرام قرار دیتا ہے تو پھر یہ مذہب کے معاملے میں غیر جانب دار کس طرح ہے بلکہ لازماً یہ اس سے متصادم ہے۔ مثال کے طور پر اسلام سود کو حرام قرار دیتا ہے' جب کہ سیکولر نظام میں اس کو قانونی تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ بہت سے ممالک میں

بغیر نکاح میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے اور ہم جنس پرستی کی قانوناً اجازت ہے' جب کہ دنیا کے ہر مذہب میں اس کی سختی سے ممانعت ہے۔ اسی طرح سیکولرازم کے بارے میں ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ یہ فرد کے عقیدے سے کوئی غرض نہیں رکھتا۔ لیکن سیکولر حکومت کا اپنے قوانین اور نظام کی اطاعت چاہنا اس کی نفی کرتا ہے۔

ہر مذہب اور نظام کی طرح اسلام بھی اپنے ماننے والوں سے کامل اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ عبادات ہوں یا نظامِ حکومت' تجارت و معیشت کا شعبہ ہو یا معاشرتی تعلقات' صلح کی بات چیت ہو یا حالتِ جنگ' جرم و سزا ہو یا عدل و انصاف' علم و ہنر ہو یا تفریح کے مواقع وہ ہر شعبۂ زندگی کے لیے واضح ہدایات دیتا ہے۔ اسلام اپنے آپ کو قطعی انداز میں روشنی کہتا ہے اور دوسرے نظریات اور غیر الہامی ادیان کو بلااستثنا تاریکی قرار دیتا ہے۔ وہ تاریکی سے کسی طور پر بھی مفاہمت کے لیے تیار نہیں۔ باطل نظریات ''کچھ دو اور کچھ لو'' کی بنیاد پر مفاہمت کر لیتے ہیں لیکن اسلام اس بنیاد پر مفاہمت کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ کیونکہ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی ذات میں خود روشنی کا منبع ہے۔ اس لیے اس کا کوئی حکم منسوخ نہیں' اس کا کوئی ضابطہ متروک نہیں اور اس کا کوئی قانون کالعدم نہیں۔ یہ خود اپنی ذات میں متحرک ہے اور اپنے ماننے والوں کو زبردست تحریک فراہم کرتا ہے اور مسلمان اس دعوے کو عین حقیقت کے مطابق پاتے ہیں۔

عملی نتائج کا جائزہ

اب ہم قانونِ فطرت کے تحت فکر و عمل کے تضاد سے قوموں کے کردار پر مرتب ہونے والے عملی نتائج کا جائزہ لیں گے۔ یہ جائزہ پاکستان کے حوالے سے لینا بہتر ہوگا کیونکہ یہاں کا منظرنامہ پوری طرح ہمارے سامنے ہے جس کا مشاہدہ بھی ہے اور عملی تجربہ بھی۔

دنیا میں فکر و عمل کے تضاد یا دوسرے لفظوں میں منافقت کا سب سے بڑا شکار پاکستانی معاشرہ ہی ہے۔ اس کی ایک ٹھوس وجہ ہے۔ جہاں جتنا تقدس کا درجہ بلند ہوگا وہاں اس کی پامالی اتنا ہی بڑا جرم اور اس کی سزا اتنی ہی سخت ہوگی۔ دنیاے اسلام میں پاکستان وہ واحد ملک ہے جو دین اسلام کی بنیاد پر وجود میں آیا لہٰذا یہاں کے عوام کے دل میں اسلام کے حوالے سے تخلیقِ پاکستان کو ایک بلند درجے کا تقدس حاصل رہا ہے۔ اس سے اُن کی بہت سی امنگیں اور آرزوئیں وابستہ تھیں اور ہیں اور اُن کو یقین تھا کہ پاکستان اُن کی امنگوں اور آرزوؤں کا مظہر ہوگا اور وہ تصور میں پاکستان کے اندر اسلام کی نشاتِ ثانیہ کا ظہور دیکھتے تھے۔ لیکن جو اس کا نتیجہ نکلا وہ بالکل اس کے برعکس تھا۔ حکمرانوں نے اوّل روز ہی سے اسلام کے بارے میں منافقانہ رویہّ اپنایا۔ اِن کے اس منافقانہ کردار کے اثرات تمام قومی اداروں پر مرتب ہوئے اور یہ اثرات آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے قوم

کی اکثریت میں بھی سرایت کر رہے ہیں۔ اگرچہ ہمارے ہر دور کے حکمران اسلام کے بارے میں ہمیشہ ایک مخمصے کا شکار رہے ہیں لیکن اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ سیکولرازم کی زلف کے اسیر ہونے کے باوجود وہ عوامی ردّعمل کے خوف سے کھلے بندوں اس کے اظہار اور حمایت سے گریزاں رہے۔

منافقت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کو پست اخلاق بنا دیتی ہے اور اخلاق و کردار کی یہ پستی جرأت و جذبے کو روند کر گزرتی ہوئی حوصلوں کو پست کر دیتی ہے۔ اس لیے ایسے پست حوصلہ معاشرے اپنے حقوق کا تحفظ کرنے کے بھی قابل نہیں رہتے بلکہ اس سے بڑھ کر اپنے حقوق کا ادراک بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عوام پسے جا رہے ہیں لیکن خاموش' راضی بہ رضا اور دم بخود بیٹھے ہیں۔

قانونِ فطرت کے فہم سے عاری ہر دور کے حکمران معاشی مسئلے کو فی نفسہٖ بنیادی مسئلہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ گھمبیر معاشی مسئلہ منافقت سے پیدا ہونے والے اخلاقی زوال اور معاشرتی انحطاط کا ایک بڑا لیکن ضمنی نتیجہ ہے۔ موجودہ فوجی حکمرانوں کی سوچ اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی آگے ہے۔ وہ سرمایہ کاری اور ترقیاتی منصوبوں کے بڑے بڑے دعووں کے ساتھ ملک کی معاشی کایا پلٹ دینے کی نوید سنا رہے ہیں۔ اُن کو معلوم نہیں کہ قانونِ فطرت کے خلاف انسان کی کوئی بڑی سے بڑی کاوش اور منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ منافقانہ طرزِعمل کی حامل' اخلاقی زوال سے دوچار اور جہالت کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی قوم کے قدموں میں چاہے دنیا بھر کے خزانوں کے ڈھیر ہی کیوں نہ لگا دیے جائیں' وہ اُن کی بندر بانٹ اور لوٹ مار تو کرسکتی ہے لیکن مثبت طور پر اس سے کوئی خاطرخواہ فائدہ حاصل نہیں کرسکتی۔ دوسری طرف حکمران ہیں کہ عقل وفہم کے ذریعے قانونِ فطرت کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں اور گھوڑے کے آگے گاڑی جوتنے پر بضد ہیں اور عالمی طاقتوں کے آلۂ کار بن کر اخلاقی زوال کو اپنی شعوری کوششوں سے مزید گہرا کرنے اور سیکولرازم کو عملی صورت دینے کے منصوبے پر عمل پیرا ہیں جو عالمی طاقتوں اور اُن کے مالیاتی اداروں اور نام نہاد مشیروں نے ترقی کے نام پر اُن کو دیا ہے' اور جسے این جی اوز قسم کی عالمی گماشتہ تنظیموں کے ذریعے روبہ عمل لایا جا رہا ہے۔

قوم منافقت کے جس المیے سے دوچار ہے اس سے کئی قسم کی معاشرتی اور نفسیاتی بیماریوں نے جنم لیا ہے اور ان ہی پیچیدگیوں سے پیدا ہونے والے بے شمار عوارض نے قوم کے جسد کو بے وزن' لاغر اور مضمحل کر دیا ہے۔ وہ قوم جو دنیا کی جملہ اقوام کی رہنمائی کے لیے اُٹھی تھی اور جس نے کائنات کو تسخیر کرنا تھا آج وہ انھی قوموں کے در پر اپنی حاجتوں کے کشکول لیے کھڑی ہے۔

عمومی طور پر اُمت مسلمہ کے لیے اور خصوصی طور پر پاکستانی قوم کے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے! بنیادی مسئلہ یہاں قیادت کی تبدیلی کا ہے۔ ایک ایسی مخلص' بے ریا' روشن خیال اور حکیمانہ فکر کی حامل دانا و بینا قیادت

اُٹھانے کی ضرورت ہے جو قوم کے اصل مرض کو سمجھنے' اُسے دُور کرنے اور درپیش مسائل کو اس کے صحیح تناظر میں حل کرنے کی بھرپور صلاحیت کی حامل ہو۔ اس کے پاس عزم و ہمت بھی ہو اور جوش و جذبہ بھی' عقل و دانش بھی اور فہم و ادراک بھی۔ جو قوم کو اس کی اصل نظریاتی اساس پر استوار کر کے ایک تابناک مستقبل کی طرف گامزن کر دے۔

عالمی سطح پر مسلمانوں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مغرب کی شاطرانہ چالوں کا صحیح ادراک حاصل کریں اور پھر اس کا رد پیدا کریں۔ دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں میں رابطے استوار کیے جائیں اور جدید ذرائع ابلاغ پر کنٹرول حاصل کر کے اُسے دنیا کے ہر فرد تک رسائی کا ذریعہ بنایا جائے' اور اسلام کے بارے میں اس جھوٹ اور مکروفریب کے تاثر کو توڑا جائے جو مغرب نے اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے اسلام کا چہرہ مسخ کر کے قائم کیا ہے۔ دین کی عمومی اساس پر دستیاب عوامی قوت کے منظم اور بھرپور استعمال' انقلابی اقدامات اور جدوجہد کے ذریعے ملک کے اندر سیاسی بالادستی حاصل کی جائے اور احکامات خداوندی کو نافذ کر کے افراد اور قوم کی کردار سازی پر خصوصی توجہ دی جائے۔ مادی وسائل کے بھرپور استعمال سے بنیان مرصوص اور عسکری قوت میں اضافہ کیا جائے۔ علوم وفنون اور ٹکنالوجی پر دسترس کے ذریعے کفار کے غلبے اور مغرب کی ہر طرح کی غلامی اور ذہنی مرعوبیت سے نجات حاصل کی جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ لازماً اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ یقیناً اللہ اپنے وعدے کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔

اس وقت اسلام بری طرح مغلوب' مسلمان اخلاقی طور پر زوال پذیر' معاشی طور پر دست نگر اور عالمی سطح پر بے وزن ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام عین حق اور روشنی ہے۔ تاریکی میں بھٹکنے والوں کے لیے اس میں بڑی کشش ہے۔ مغرب کی مادہ پرست تہذیب کے اندر اب لوگوں میں جو روحانیت کی طلب پیدا ہو رہی ہے اسلام اس طلب کو پورا کرنے کی زبردست قوت رکھتا ہے۔ ان حالات میں اگر مسلمان کردار کی مضبوطی کے ساتھ' اللہ کے بھروسے پر اسلام کی نظریاتی دعوت کو عام کرنے' عوام کو منظم کرنے اور دین کو غالب کرنے کے لیے بھرپور اور منظم جدوجہد کریں تو وہ وقت بھی آئے گا کہ جب یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کے قول ربانی کے مطابق لوگ فوج درفوج اسلام میں داخل ہوں گے۔

اس طرح مغرب اور غیر مسلم دنیا کے اندر' خود انھی میں سے' اسلام قبول کرنے والوں کی ایک موثر تعداد پیدا ہو جائے گی۔ یہ آبادی عالم اسلام کے لیے بڑی تقویت کا باعث ہوگی۔ یہ نئے پُر جوش مسلمان خود اپنے ملکوں میں اسلام کے خلاف اپنے ملکوں کی پالیسیوں اور سازشوں میں مزاحم ہوں گے۔ غیر مسلم دنیا اور خاص طور پر مغرب بالکل ایک نئی صورتِ حال سے دوچار ہوگا۔ اِس سے اُن کی شاطرانہ چالیں اور جارحانہ قوت دم توڑ جائے گی اور مسلمان ایک نئے دور کا آغاز کریں گے۔ ان شاء اللہ!

۱۴۲۳ھ ـــــ توسیع اشاعت کا سال

جب ارادہ ہو تو راستے خود نظر آتے ہیں!

- آپ خریدار ہیں ـــــ ایک خریدار بنانے کا ارادہ کریں اور اسے پورا کریں' خواہ ۵ یا ۱۰ افراد سے کہنا پڑے۔
- آپ کسی سے لے کر پڑھتے ہیں ـــــ خرید کر پڑھیے۔
- اگر ۲۰۰ روپے خرچ کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں تو کسی عزیز/ دوست کے نام' کسی رشتہ دار طالب علم/ طالبہ کے نام کامیابی پر یا کسی اور بہانے سال بھر کے لیے جاری کروا دیں۔
- کسی سطح پر نظم کے ذمہ دار ہیں تو ـــــ ◻ علاقے کے تمام امکانی خریداروں کے نام نمونے کا پرچہ بھیجنے کا اہتمام کریں۔ ◻ کارکنوں کو بیت المال سے اضافی شمارے فراہم کریں کہ وہ مہم چلا سکیں۔ ◻ دفتر ترجمان سے مطلوبہ تعداد میں بروشر طلب کریں۔ ◻ سربرآوردہ افراد کے نام بیت المال سے بطور ہدیہ جاری کروائیں (کسی بھی ضلع کے لیے ۵۰ کا ہدف بہت زیادہ نہیں ہے)
- کسی برادر/ خواہر تنظیم میں ذمہ دار ہیں تو جائزہ لیں کہ یہ کس طرح سب وابستہ افراد تک پہنچایا جائے۔
- بیرون ملک حلقے سے وابستہ ہیں تو ◻ خود ضرور خریدار بنیے' دیکھیے کہ سب کارکن خریدار ہیں۔ ◻ باہر کے حلقے کے افراد کو پہنچائیں۔ ◻ پاکستان میں ۱۰' ۱۰ خریداریاں بھیجیں۔
- کسی اسکول نیٹ ورک کے ذمہ دار ہیں تو سب اسکولوں کے لیے جاری کروائیں۔

سالانہ منصوبے میں ۲۵ فی صد اضافہ ہدف ہے

سہ ماہی جائزہ لیں' تدابیر سوچیں' اختیار کریں

نہ بہت وقت چاہیے' نہ بہت مال

صرف ارادہ اور تھوڑی سی کوشش --- لیکن اجر جمیل نہایت

ترجمان القرآن' ۵-اے' ذیلدار پارک' اچھرہ' لاہور-۵۴۵۷۰' فون: ۷۵۸۷۹۱۶ فیکس: ۷۵۸۵۵۹۰

عصری تقاضے' دعوت اور اجتہاد

خرم مرادؒ

محترم خرم مرادؒ نے پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن (PIMA) کے ایک اجلاس میں ''مسلمان ڈاکٹر سے اسلامی معاشرہ کی توقعات'' کے موضوع پر خطاب کیا تھا۔ اس فکرانگیز خطاب میں ڈاکٹروں کے لیے ہی نہیں' ہر میدان کے ماہرین کے لیے بہت کچھ رہنمائی ہے۔ ہم اسے کیسٹ سے تدوین کر کے پیش کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

مسلمان معالج سے اسلامی معاشرے کی توقعات کیا ہیں اور ان توقعات کو کیسے پورا کیا جا سکتا ہے؟ اس موضوع میں ایک مشکل یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ فی الواقع کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ اس لیے اس سوال کا اضافہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُس اسلامی معاشرے کو وجود میں لانے اور تشکیل دینے کے لیے' اُس کو باقی رکھنے اور ترقی اور عروج کی راہ پر آگے بڑھانے کے لیے ایک مسلمان معالج سے کیا توقعات رکھی جاسکتی ہیں؟

اسلامی معاشرے کا تصور ایک آئیڈیل بھی ہے' اور ایک حقیقت بھی۔ یہ کہنا کہ یہ کہیں موجود نہیں ہے' یہ اس کے آئیڈیل معنوں کے لحاظ سے ہے۔ آئیڈیل کی حقیقت یہ ہے کہ وہ موجود بھی ہوتا ہے اور نہیں بھی ہوتا۔ اسلامی معاشرے کا آئیڈیل ہر لمحے حاصل بھی ہوتا رہتا ہے' اور کسی بھی لمحے صحیح معنوں میں حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ ایک آئیڈیل روشنی کے مینار کا کام کرتا ہے' وہ راہ کو روشن کرتا ہے' ندا دیتا ہے اور لوگ اُس کی جستجو اور آرزو میں اپنی عمریں صرف کر دیتے ہیں' پہلے ہی قدم پر منزل پا لیتے ہیں' یا آخری سانس تک اُسی کی تمنا اور آرزو کے ساتھ جیتے رہتے ہیں۔

دو انسانی وظائف ایسے ہیں جو ایک نبی اور رسول کے وظائف سے بڑے مشابہہ اور قریب ہیں۔ ایک وظیفہ تو تعلیم کا وظیفہ ہے۔ نبی کریمؐ نے خود فرمایا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں' اور قرآن مجید نے بھی بار بار اُن کے اس پہلو کا ذکر کیا' اس لیے کہ نبی بنیادی طور پر ایک معلم ہوتا ہے۔ دوسرا انسانی وظیفہ طبیب یا معالج کا وظیفہ ہے' اس لیے کہ نبی بھی ایک نسخۂ شفا لے کر انسانوں کے پاس آتا ہے۔ اُس نسخے کے بارے میں اعلان کیا گیا ہے کہ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى ٱلصُّدُورِ ۙ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ

لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ○ (یونس ۱۰:۵۷) ''لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو سینوں کے امراض کی شفا ہے اور اہل ایمان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے''۔ شفا کے معنی محض دوا اور علاج کے نہیں ہیں۔ دوا، علاج اور شفا کے فرق پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔

شفا کا مطلب زخموں کو مندمل کرنا ہے۔ البتہ جو کچھ بھی سینوں کے اندر اور شخصیات کے اندر چھپا ہوا ہے، جو پیشہ ورانہ تقسیم کے لحاظ سے ایک حد تک ماہرین نفسیات کے دائرے میں آتا ہے، لیکن میرے خیال میں یہ کسی بھی معالج کے دائرے سے باہر نہیں ہوسکتا۔ جو کچھ انسان کے سینے میں پوشیدہ ہے وہ صرف قلب ہی نہیں ہے جس سے کوئی معالج یا کارڈیالوجسٹ بحث کرتا ہے، بلکہ صدور انسانی میں قلوب کی ایک اور قسم بھی پائی جاتی ہے، جس کے امراض کے لیے نسخۂ شفا انبیاے کرام لے کر آتے ہیں۔ وہ ایک طبیب اور ڈاکٹر کی طرح اُن انسانوں کا علاج کرتے ہیں جو اُن کی تعلیم کے نتیجے میں ان کے قریب آتے ہیں، ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہیں، اُن کے پیچھے چلتے ہیں اور اُن کا دامن پکڑ لیتے ہیں۔ اسی طرح وہ ایک طبیب کی طرح اُن معاشروں کا بھی علاج کرتے ہیں جن معاشروں میں وہ آنکھ کھولتے ہیں، ان کے مسائل کو حل کر کے صحیح بنیادوں اور خطوط پر معاشرے کی تعمیر کر کے انھیں شفا بخش کر ایک بالکل نئی شکل و صورت عطا کرتے ہیں۔ انبیاے کرام کا مشن یہی ہوتا ہے کہ وہ تاریخ ساز قوتوں کو اپنی گرفت میں لے کر، تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیں اور ایک نئی دنیا، ایک نیا جہان اور ایک نیا معاشرہ وجود میں لائیں۔

ایک طبیب اور ڈاکٹر اُس گوشت کے لوتھڑے سے بھی تعارف حاصل کرتا ہے جو قلب کے نام سے سینے میں پایا جاتا ہے، انسانی نفسیات سے بھی بحث کرتا ہے جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ وہ جسمانی امراض پر گہرا اثر ڈالتی ہے، اور جسم سے بھی بحث کرتا ہے اس لیے کہ جسم کو روح اور نفسیات اور قلب سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی ذمہ داریوں اور فرائض کا ایک دائرہ ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم ایک آئیڈیل اسلامی معاشرے کی بات کرتے ہیں، اس معاشرے کے لحاظ سے جو انبیا کا آئیڈیل ہوتا ہے، اُس کی نسبت سے بھی معاشرہ ایک معالج کے وظائف، فرائض اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے کچھ توقعات رکھ سکتا ہے۔

تعلیم کا تعلق انسان کی پوری شخصیت سے ہوتا ہے۔ معالج کا تعلق ایک انسان کی زندگی کے اُن گوشوں، اُن وارداتوں اور اُن لمحات و واقعات سے ہوتا ہے جن تک کسی کی پہنچ نہیں ہے۔ وہ جسم سے بھی بحث کرتا ہے اور نفسیات اور قلب سے بھی۔ اِس سے بڑھ کر پیدایش اور موت سے بھی، جو انسانی زندگی کے سب سے اہم سنگ میل ہیں۔ پیدایش اُس کو وجود بخشتی اور موت اس کو دنیا سے لے جاتی ہے، ان دونوں میں بھی ایک معالج شریک ہوتا ہے۔ جب ایک انسان کے اندر درد و الم کے سائے گہرے ہوتے ہیں، اور اُس کے قلب سے فریاد

اُٹھتی ہے تو وہ دوڑا دوڑا اپنے معالج کے پاس جاتا ہے۔ کبھی خیال کرتا ہے کہ اُس کی دی ہوئی سفید گولی سے درد دُور ہو جائے گا، اور تحقیقات بتاتی ہیں کہ سفید گولی اتنا کام نہیں کرتی جتنا کہ مریض کا اپنا اعتماد، معالج کا دست شفقت اور اس کی قربت مریض کی صحت یابی کے لیے کام کرتی ہے۔ ایک معالج کے لیے پیشے کا لفظ ابھی تک میں نے جان بوجھ کر استعمال نہیں کیا تھا، لیکن اب میں کر رہا ہوں، اس لیے کہ اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ میں وظیفے کا لفظ استعمال کر رہا تھا لیکن یہ لفظ تصوف کی اصطلاح بھی ہے اور ذکر و اوراد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ وظیفے کے معنی اُن فرائض کے بھی ہیں جو آدمی پابندی سے ادا کرتا ہے۔ پیشے کا ترجمہ بھی شاید وظیفہ ہو سکتا ہے۔ گویا اپنے پیشے اور وظیفے کے لحاظ سے معالج انسان کا سب سے بڑا رقیب ہوتا ہے، ہو سکتا ہے اور اسے ہونا چاہیے۔

معالج ایک فرد سے، نہایت گہرے انداز میں، اُس کے جسم، قلب، نفسیات اور روح سے مربوط ہے۔ انسان اور انسان کے ملنے سے تعلقات جنم لیتے ہیں، اُن کے درمیان تبادلوں سے خاندان، ریاست، محلّہ اور پڑوس جیسے ادارے وجود میں آتے ہیں۔ کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں ہے جو معالج کی طرف نگاہ اُٹھا کر نہ دیکھے۔ پھر اُس کا اپنا علم، علم طب یا میڈیسن اور سرجری، طبی ادارے، کلینک، ہسپتال، طبی امداد پہنچانے کے انتظام اور ہیلتھ کیئر سسٹم جو کہ معاشرے کی تعمیر میں اور کسی بھی نصب العین کی طرف رہنمائی میں اور اُس کی فلاح و بہبود میں ایک کلیدی کردار ادا کرتے ہیں وہ بھی معالج سے کچھ توقعات رکھتے ہیں، اور رکھ سکتے ہیں۔ معالج کا یہ وظیفہ اور کردار صرف اسلامی معاشرے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ کوئی بھی عام انسانی معاشرہ ہو، غیر اسلامی ہو یا کافر یا لادین، ان کے درمیان معالج سے توقعات کا ایک بڑا مشترک حصہ پایا جائے گا۔ یہ مشترکہ دائرہ چونکہ ہمارا آج کا موضوع نہیں ہے، اس لیے میں اس پر بحث نہیں کروں گا۔

ہر معاشرہ توقع رکھے گا کہ معالج کو جو تعلیم و تربیت دی گئی ہے، جس کا اُس نے حلف اُٹھایا ہے، جو اس کے علم کا تقاضا ہے، وہ اُس کو ایمان داری اور مہارت کے ساتھ، انسان کی عزت و حرمت اور مقام و مرتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے بجا لائے۔ اس کے جواب میں بالعموم معاشرہ اس کو عزت و احترام دے کر سرداری کے مقام پر بٹھا دے گا۔ قبائلی معاشروں میں وچ ڈاکٹر، یعنی جادوگر ڈاکٹر قبیلے کے سرداروں کو اور قبیلے کے افراد کو اپنے پیچھے چلایا کرتے تھے۔ آپ وچ ڈاکٹر کا لفظ سن کے کچھ تنفر کا اظہار نہ کریں، اس لیے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں، مرض، مریض، علاج اور اس کے تصورات معاشرے میں رائج ہوتے ہیں۔ آج آپ جن تصورات کے تحت مرض، دوا، علاج اور مریض کا کام کر رہے ہیں، یہ بھی ایک دور کا عکس اور ایک تہذیب کی پیداوار ہے۔ یہ دور مغرب کی پیدا کردہ تہذیب کا دور ہے۔ میڈیسن کی سوشیالوجی پر جو مطالعے کیے گئے ہیں، ان کی بنیاد پر لوگ

کہتے ہیں کہ کل کے وچ ڈاکٹر اور آج کے ہولی سٹی میں بیٹھے ہوئے ڈاکٹر میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔کل کے توہمات اور آج کی الرجی اور جراثیم میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔

ایک عام انسانی معاشرے میں' خواہ وہ کسی بھی تصورِ انسان' کسی بھی تصورِ مرض اور مریض' اور کسی بھی تصورِ دوا کے تحت اپنے بیماروں کا علاج کرتا ہو'اور ایک اسلامی معاشرے میں بہت سی چیزیں مشترک ہوں گی۔ شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ تصورِ انسان' تصورِ کائنات' تصورِ مرض' تصورِ مریض اور تصورِ دوا' یہ شاید کچھ فلسفے کی بات ہو۔لیکن یہ فلسفہ نہیں ہے' اس لیے کہ آپ نے خود ہی معالج کے ساتھ' ایک اور لفظ کا اضافہ کر دیا ہے اور وہ ہے ''مسلمان''، اور صرف معاشرے کو کافی نہیں سمجھا بلکہ ''اسلامی'' کے لفظ کا اضافہ کیا ہے۔اس لیے ان دونوں الفاظ سے دامن نہیں چھوٹ سکتا۔تصورِ کائنات' تصورِ انسان' مرض اور مریض اور دوا کے درمیان کیا باہمی تعلق ہے؟ اس پر غور وفکر اور بحث وتمحیص کے نتیجے میں ہی یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ ایک مسلمان معالج سے معاشرہ کیا توقعات رکھ سکتا ہے۔

آج کے معاشرے کو بہت سارے لوگ اسلامی معاشرہ کہنے سے ہچکچاتے ہیں' اور مجھے بھی اس میں کچھ تحفظات ہیں۔ کچھ اس کو صرف مسلمان معاشرہ کہتے ہیں' لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک مسلمان معاشرے' اور ایک اسلامی معاشرے میں کیا فرق ہے۔آج کا معاشرہ' جس کے اندر اسلامی روح کو جاری و ساری کرنا اور اسلامی نظام کی تشکیل ہمارے پیش نظر ہے' اور وہ مسلمان معالج جو معاشرے میں صحت' علاج معالجے اور شفا کی ذمہ داریاں اٹھائے ہوئے ہیں' یہ بات خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ معاشرہ ایک مغلوب معاشرہ ہے۔ یہ معاشرہ صرف سیاسی اور عسکری طور پر ہی مغلوب اور غلام نہیں ہے بلکہ تہذیبی طور پر بھی غلام ہے۔اگر ہم مسلم معاشرہ اور مسلمان معالج دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باہم مربوط کر دیں' تو پھر ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس مغلوبیت کے حوالے سے بھی یہ معاشرہ اپنے معالج سے کیا توقعات رکھ سکتا ہے؟

جدید طب اور اجتہاد کی ضرورت

پچھلے ۳۰۰ سال سے جو سوچ' فکر' زبان اور تہذیب وثقافت دنیا کے اندر غالب ہے یہ وہ ہے جس نے مغرب کے لادینی لبرل اور سیکولر ماحول میں پرورش پائی ہے۔کوئی بھی تہذیب اپنے افکار ونظریات سے عاری نہیں ہو سکتی۔اس کا پرتو اور عکس ہر چیز میں دیکھا جا سکتا ہے۔جس طرح اسلامی معاشرے کی بنی ہوئی ہر چیز اسلامی رُوح کی آئینہ دار ہوگی' خواہ وہ اُس کا آرٹ ہو یا ثقافت' اس کی محرابیں اور منبر ہوں یا نقاشی اور خطاطی' یا اُس کا ادب' کوئی بھی چیز اِس سے خالی نہیں ہو سکتی۔میں چونکہ انجینیر ہوں' گو کہ آج ڈاکٹروں کے سامنے کھڑا کر دیا گیا ہوں' اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی فن تعمیر میں' توحید کا وجود بہت ساری کتابوں کا موضوع

ہے۔ اگر اسلامی فن تعمیر میں توحید پائی جاسکتی ہے تو اسلامی دوا اور مسلمان معالج میں' اور اسلامی طریقۂ علاج اور اسلامی شفاخانے میں کیوں نہیں پائی جاسکتی۔ اگر ہمارے پیش نظر اسلامی معاشرے کی تشکیل ہے تو ہم یہ حقیقت تسلیم کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے کہ اسلام' اسلامی روح اور اسلامی نظام دنیا کے اندر غالب نہیں ہے بلکہ مغرب غالب ہے۔ ہماری پارلیمنٹ ہو یا بازار' یا ہمارے بنک اور یونی ورسٹیاں' سب کے سب انھی کے بنائے ہوئے اصول وضوابط کی پیروی کر رہے ہیں۔ اُن کا تصورِ انسان و کائنات' اُن کا مرض' مریض اور دوا کا تصور' یہی وہ چیزیں ہیں جنھوں نے طبِ جدید کو تشکیل دیا ہے' کہیں شعوری اور کہیں غیرشعوری طور پر' کہیں جانتے بوجھتے اور کہیں بے جانے بوجھے۔ جو بھی اس گرد آلود ماحول میں آئے گا' وہ کچھ نہ کچھ تو گرد ضرور پھانکے گا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں ایک معالج کے طور پر سب سے بڑھ کر جو ذمہ داری معاشرے کو اسلامی بنانے کے لیے اور اسلامی معاشرے کو وجود میں لانے کے لیے ضروری ہے' وہ اجتہاد کی ذمہ داری ہے تاکہ مغرب کے تصورِ طب کو بدلا جاسکے۔

اجتہاد کا لفظ ذرا غور طلب ہے۔ اس سے ملتا جلتا ایک اور لفظ جہاد ہے وہ بھی اسی لفظ سے بنا ہے جس سے اجتہاد کا لفظ نکلا ہے۔ وہ بھی غور طلب ہے۔ اجتہاد یہ ہے کہ معاشرے کے اندر طبی لحاظ سے جو پس ماندگی ہے' اور پس ماندگی سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ ہسپتال کم ہیں' بستروں کی تعداد کم ہے' طریق علاج ناقص ہے' مریضوں کی خبرگیری نہیں ہوتی' یا حکومت کے وسائل غریبوں کے علاج پر خرچ نہیں ہوتے' بلکہ اس سے میری مراد طبی فکری پس ماندگی ہے' اور اس کا علاج اجتہاد کی ایک طاقت ور لہر کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ یہی خواب دیکھتے رہے کہ اگر دنیا کے اندر اسلام کو غالب ہونا ہے تو اسلامی نظام' شریعت اور فقہ میں' اجتہاد کے ذریعے ایک نئے دور کا آغاز کرنا ہوگا جس کا رشتہ نہ ماضی سے کٹا ہوا ہو' نہ وہ حال کے تقاضوں سے بے نیاز ہو' اور نہ وہ مستقبل کو قریب لانے میں ہی رکاوٹ بنے۔ جس طرح فقہ اور شریعت کے بارے اقبالؒ کا یہ خیال تھا اسی طرح علمِ طب اور میڈیسن اور اس علم کے تمام گوشے اجتہاد کے منتظر ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ اجتہاد معالج خود کرسکتے ہیں' اس لیے کہ آج کا زمانہ کثیرالعلمی کا زمانہ ہے' لہٰذا محدثین' فقہا' مفسرین' علما اور سوشیالوجسٹ سب مل کر بیٹھیں گے تو اجتہاد ہوسکے گا۔

چند غور طلب مسائل

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آج وہ بحثیں جو خود اُس گہوارے میں چھڑی ہوئی ہیں' جہاں جدید علمِ طب نے جنم لیا' پروان چڑھا اور اپنے عروج پر پہنچا ہے' اُن بحثوں سے مسلمان معالج بے نیاز ہیں' یا بڑی حد تک لاعلم ہیں' یا وہ صلاحیت نہیں رکھتے کہ اس سے بحث کرسکیں۔ مغرب کا یہ نظریہ کہ انسان ایک مشین کی مانند

ہے' وہ مشینی قوانین کے تحت چلتا ہے--- یہ نیوٹن کا نظریہ تھا جس پر کائنات بنی تھی' وہ نظریہ خود شکست و ریخت کا شکار ہو چکا ہے۔ لہٰذا انسان کو مشین سمجھ کر جو علاج کیا جاتا ہے' اُس سے ہاتھ اُٹھانا پڑیں گے۔ یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ جس کے بارے کہا گیا ہے: نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ (الحجر ۱۵:۲۹) یعنی میں نے اس میں اپنی روح پھونکی ہے' اور وہ انسان جو دل اور روح دونوں کا مجموعہ ہے' دونوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات مشاہدے میں ہے کہ اگر کہیں انسان کو گالی سننا پڑتی ہے تو اس کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے' اور اگر کہیں خوش خبری ملتی ہے تو اس کی صحت بہتر ہونے لگتی ہے۔ لہٰذا جسم' مرض اور قلب و روح یہ ایک دوسرے سے لاینفک ہیں۔

جب تک یہ تصورِ کائنات' علمِ طب' طریقۂ علاج' علاج کے نظام اور دوا کی روح نہیں بنے گا' اُس وقت تک اسلامی معاشرے میں' جو طب رائج ہوگی' اُس کی داغ بیل نہیں ڈالی جا سکتی۔ اسلامی معاشرہ ایک پھونک مار کے راتوں رات نہیں بنے گا' یہ تو ایک طویل جدوجہد چاہتا ہے۔ اس لیے اس تصورِ طب کو فروغ دینے کے لیے جدوجہد کرنا ہوگی اور ترجیحات کا تعین کرنا ہوگا۔ اسی طرح اس طریق علاج کو اپنانے سے مرض' علاج اور شفا میں فرق کرنا پڑے گا۔ صرف دوا دینا علاج نہیں ہے بلکہ شفا بخشنا علاج کا مقصد ہے۔ طبیب اور مریض کے تعلقات مغرب میں ہم سے شاید بہت بہتر ہیں' پھر بھی ان کے اندر وہ روح نہیں ہے جو اُس صورت میں ہوگی جب انسان کو اللہ کا خلیفہ اور اللہ کی رُوح کا حامل سمجھا جائے گا۔

مغرب کا نظامِ طب امیروں کے لیے بنا ہے۔ اس سے امیر ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس نظام میں یا تو ریاستیں' فلاحی ریاست بن کر مریض کا بوجھ اٹھاتی ہیں یا پھر چند دن میں یہ جائزہ لینے کے بعد کہ یہ بوجھ ہم نہیں اُٹھا سکتے' مریض کو ازسرنو انشورنس کے لیے کہا جاتا ہے جو عام آدمی کے بس سے باہر ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ معاشی طور پر پس ماندہ ممالک میں' کیا یہی نظامِ علاج نافذ ہوگا؟ یہ بھی بڑا اہم اور غور طلب سوال ہے۔ اس طرح کے بہت سے سوالات ہیں جو اجتہاد کے طالب ہیں اور غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ طبیب اور ڈاکٹر حضرات منظم ہوں' کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے ہوں' تحقیقی کام سرانجام دے رہے ہوں' وقتاً فوقتاً جمع ہو کر جائزہ لیتے ہوں' تحقیقی کاوشیں' تحقیقی مقالے پیش کیے جاتے ہوں' ان پر بحث و تمحیص اور غور و فکر بھی ہو لیکن جدید مسائل کا تذکرہ ہی نہ ہو' اور یہ مسائل زیرِ بحث ہی نہ آئیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان کچھ کرنے کی کوشش تو کی جا رہی ہے لیکن بحیثیت مسلمان معالج اس چیلنج کو محسوس ہی نہیں کیا جا رہا جو جدید دور نے آپ کے سامنے رکھا ہے۔

ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہسپتال میں مریض کا علاج پانا اب خود محلِ نظر ہے۔ اُس کو اپنے خاندان اور رشتہ داروں سے' محبت کرنے والوں' ملنے جلنے والوں اور اہلِ محلہ سے کاٹ کر ایک الگ کمرے میں ڈال دینا'

جہاں آنے والے کو صرف ایک منٹ کے لیے دبے پاؤں اجازت لے کر عیادت کی اجازت ہو' کیا یہ طریقہ شفا کے لیے زیادہ موزوں ہے' یا یہ کہ آدمی اپنے محبت کرنے والوں کے درمیان اپنے پڑوس اور محلے والوں اور خاندان کے درمیان رہ کر علاج کروائے؟ میری ان باتوں کو آپ دقیانوسی نہ سمجھیں' اس لیے کہ یہ مباحث خود اب اُس تہذیب کے گہوارے میں بڑے زور کے ساتھ جاری ہیں جہاں جدید طب نے جنم لیا اور عروج پکڑا۔ ممکن ہے آپ میں سے بہت سے اہل علم اس سے واقف ہوں' اور بہت سے ناواقف۔

سوال یہ ہے کہ کیا پیدایش جیسے ذاتی عمل کو' ایک جراثیم سے پاک کمرے میں منتقل کیا جا سکتا ہے؟ اور موت جیسے انتہائی سنگین مرحلے کو' پوسٹ مارٹم' مردہ خانے اور کفن کے اندر ملبوس کر کے' اُس سے انسان کو موت کی حقیقت سے آگاہ کیا جا سکتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اداروں اور ریاست نے' ڈاکٹروں اور طبیبوں نے انسان کی زندگی کے اُن گوشوں میں بھی دخل دینا شروع کر دیا ہے جو گوشے اُس کی ذاتی ملکیت ہوا کرتے ہیں' جہاں اس کی پرائیویسی ہوا کرتی تھی' اُس کی اپنی شخصیت ہوا کرتی تھی؟ کیا ہم مسلمان معاشروں کے اندر جو اسلامی بھی ہیں اور غیر اسلامی بھی' اُن سارے اصولوں' فلسفوں اور سارے طریقوں کو اُسی طرح اختیار کر لیں گے جس طرح مغرب کے لبرل' سیکولر' مشینی (میکنسٹ) تصورِ کائنات کے تحت بنائے گئے معاشروں میں اختیار کیے گئے ہیں؟

یہ بحث طب کے بارے ہی میں نہیں ہے' بلکہ ہر چیز کے بارے میں ہوگی' لیکن میں نے اس کو صرف طب تک محدود رکھا ہے۔ میڈیکل پروفیشن کی اخلاقیات سے تو ہم اکثر بحث کرتے ہیں' لیکن طریق علاج کی اخلاقیات اور علاج میں ترجیحات کی اخلاقیات پر ہم غور نہیں کرتے۔ آج یہ بھی ایک بڑا گرم موضوع ہے: کیا ایک مریض کو لاکھوں روپے' ڈالر یا پاؤنڈ خرچ کر کے ہارٹ اٹیک سے بچانا اخلاقی طور پر زیادہ اہم ہے' یا اُسی پیسے سے اُن ۱۰ ہزار آدمیوں کو علاج فراہم کرنا زیادہ ضروری ہے کہ جو مختلف امراض کے تحت تکلیف دہ زندگی گزار رہے ہیں' اور تھوڑی سی توجہ سے ایک بہتر انسان بن سکتے ہیں؟ کیا وہ اخلاقی طور پر زیادہ قابل ترجیح نہیں ہیں؟ خود دل کا مریض ہونے کے باوجود میں یہ سوال اُٹھا رہا ہوں' اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑا اہم سوال ہے!

کیا ایک ماں جو بچے سے محروم ہو' اور جدید فرٹیلائزیشن کے طریقوں سے لاکھوں روپے صرف کر کے ایک بچے کو جنم دے سکتی ہو' کیا اُس ایک بچے کی پیدایش پر لاکھوں روپے صرف ہونے چاہییں یا وہ ہزاروں بچے جو معذور ہیں یا تعلیم سے محروم ہیں' میلے کچیلے کپڑے پہنتے ہیں' گلیوں میں آوارہ پھرتے ہیں' یہ قومی وسائل اُن پر لگائے جانے چاہییں؟ یہ اور اس قسم کے دیگر مسائل مسلمان معالج کی نظر اور فکر کے لیے قوت اجتہاد کے

محتاج ہیں۔ لیکن اس کے لیے صرف اجتہاد ہی کافی نہیں ہے' اس لیے کہ ہم ایک ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جس کو غیر اسلامی تو میں ہرگز نہیں کہوں گا لیکن اسے اسلامی کہتے ہوئے بھی مجھے ہچکچاہٹ ہوگی۔

عملی تقاضے

میں ابتدا ہی میں آئیڈیل کی تعریف کر چکا ہوں کہ آئیڈیل کا وجود ایک ہی وقت میں ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی۔ جب ایک مکمل آئیڈیل سامنے ہو' تو کچھ ہوگا اور کچھ نہیں ہوگا' لیکن اس معاشرے کو اپنے آئیڈیل کی طرف آگے بڑھانا' یہ ہر اُس شخص کا فرض ہے جو اس معاشرے کے اندر بستا ہو' جس کا ماضی' حال اور مستقبل سب اسی معاشرے کے ساتھ وابستہ ہوں' اور یہ کام جہاد کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

یہ کوئی حسن اتفاق نہیں ہے کہ جہاد اور اجتہاد دونوں لفظ عربی زبان میں ایک ہی مادے سے نکلے ہیں۔ درحقیقت جہد اور کوشش سے ہی اجتہاد کے دروازے کھلتے ہیں۔ مستقبل کے دروازوں پر انسان دستک دے سکتا ہے' آگے بڑھ کر اپنی پیش قدمی کی راہیں کھول سکتا ہے' نت نئے مسائل سے نمٹ سکتا ہے' اور ایک نئے دور کا آغاز کرسکتا ہے--- لیکن جو لکیر کے فقیر ہوں' کنوئیں کے مینڈک ہوں' ماضی کے ساتھ چمٹے رہیں' مستقبل اُن کا نہیں ہے۔ آج تک کبھی نہیں ہوا اور آیندہ بھی کبھی نہیں ہوگا۔

جس مسلمان معاشرے نے مدینہ کی چھوٹی سی بستی سے نکل کر اسپین سے لے کر چین تک ایک زندہ متحرک اور غالب تہذیب کو برپا کر دیا تھا' وہ ایک انتہائی اعلیٰ مجتہدانہ خصوصیات سے آراستہ معاشرہ تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے کنوئیں کا مینڈک بن کر' لکیر کا فقیر بن کر نہیں چل رہا تھا بلکہ وہ نت نئے مسائل کے ساتھ' نمٹنے کی جرأت رکھتا تھا اور اُن کو حل کرسکتا تھا۔ وہ معاشرہ جہاں ایک طرف اجتہاد کی قوت سے مالا مال تھا وہاں دوسری طرف جہاد کرنے کی بھی جرأت رکھتا تھا۔ وہ اپنے معاشرے کو اسلامی بنانے کے لیے' ساری دنیا میں جاہلیت کے آتش کدے بجھانے کے لیے' انسانی خدائی کے سارے محلات مسمار کرنے کے لیے' اپنی جان اور مال قربان کرنے اور ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے بھی تیار تھا۔ یہ سب کچھ اجتہاد اور جہاد کی بدولت ہی ممکن ہوا۔ صرف ایک چیز کے ساتھ دنیا میں غلبہ' تخلیق نو اور حیات نو کبھی نصیب نہیں ہوسکتی۔

اس لیے ایک ایسا معاشرہ جو کچھ اسلامی بھی ہو اور نہیں بھی' اور جس کے سامنے مکمل اسلامی بننے کا روشنی کا مینار بھی موجود ہو' جس کی کسک اور طلب اور جس کی آرزو اُس کے اندر موجود ہو' وہ ایک معالج سے یہ توقع رکھ سکتا ہے کہ وہ اس وظیفے کو انجام دے جو انبیا کے وظیفے کی مانند ہے اور اس جہاد میں اپنا حصہ ادا کرے۔ وہ معالج سب سے بڑھ کر اس بات کا اہل ہے کہ وہ اس وظیفے اور جہاد کو ادا کرے' ان معنوں میں نہیں کہ وہ مرہم پٹی کا سامان لے کر جہاد میں پہنچ جائے بلکہ جہاد زندگانی میں اُن عقائد کو' اُس نصب العین اور ان اقدار کو غالب کرنے

کے لیے اور اپنا مال خرچ کرنے اور اپنی جان لڑانے کے لیے تیار ہو۔ اگر علاج بھی کرے تو یہ جانتا ہو کہ میرا کام صرف اُس سواری کو ٹھیک کر دینا نہیں ہے' جس سواری پر انسان کی عقل اور روح سوار ہے' بلکہ اس کے پیش نظر خدا کا عائد کردہ فریضہ بھی رہے کہ اس کا کام محض مریض کا علاج کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اسے اس تصور سے آشنا کرنا اور اس مقصد کے حصول کے لیے تیار کرنا بھی ہے کہ وہ دنیا کے اندر ایک صالح معاشرے کو وجود میں لائے اور آخرت میں اپنے رب کی رضا اور خوشنودی سے ہم کنار ہو۔

ایک معالج محض معالج نہیں ہے کہ جس کو صرف علاج معالجے سے غرض ہو۔ وہ انسان کا معالج ہے' جانوروں کا نہیں کہ ایک وٹرنری ڈاکٹر کی طرح محض جسم کا علاج کر کے اپنے آپ کو اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش سمجھے۔ یہ صحیح ہے کہ انسان کا جسم جانور کے جسم کی طرح کا ہی ہے' وہی خواہشات اور آرزوئیں ہیں' وہی کمزوریاں' وہی بھوک' بڑھ بڑھ کر کھانے پینے کی خواہش اور ہر کھیت میں منہ مارنے کی ہوس' اور وہی ہر جگہ اپنا حصہ وصول کرنے کی خواہش اور اپنی خواہش پورا کرنے کی تڑپ اس میں بھی پائی جاتی ہے۔ مگر دوسری طرف یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ یہ جسم تو اس کے لیے سواری ہے۔ اس پر سوار ہو کے' اُس نے اپنی منزل' آخرت تک جانا ہے۔ اسے خدا کے ہاں اپنے عہد و پیمان اور فرائض اور ذمہ داریوں کے لیے جواب دہ ہونا ہے۔ اگر ایک مسلمان معالج بھی مغرب کے تصورِ انسان اور تصورِ کائنات کے تحت جہاں انسان کو ایک جانور کی طرح سمجھا جاتا ہے اور Man is animal کے تحت پورا نظامِ طب بنایا گیا ہے' اپنے آپ کو اسی کے مطابق صرف انسانی عقل اور جسم کے گھوڑے' اور اُس کی جسمانی سواری کے علاج تک محدود کر لے تو پھر وہ ڈاکٹر تو ضرور ہو گا لیکن ایک مسلمان ڈاکٹر نہیں ہو گا۔

ہر ڈاکٹر صرف یہی کرنے لگے کہ اپنے وظیفہءِ عمل کو' اپنے پیشے کو' اُس جہاد زندگی کے لیے وقف کر دے اور حضرت یوسفؑ کی طرح اگر جیل میں قیدی خواب کی تعبیر پوچھنے کے لیے بھی آئیں تو وہ اس بات کا موقع نکال لے کہ ان سے کہے: ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ ○ (تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ یوسف ۱۲:۳۹)' یہ لو لگی ہوئی ہو' یہ شمع سینے کے اندر جل رہی ہو' تب جا کر دعوت کا کام ہوتا ہے۔ دعوت کا کام محض پمفلٹ اور ہینڈ بل کے ذریعے یا تقریروں اور کتابچوں کے ذریعے نہیں ہوتا' اگر ہوتا بھی ہے تو بہت کم۔ دعوت کے کام کے سوتے تو آدمی کے اندر سے پھوٹتے ہیں۔ ہم اکثر یہ استعارہ اور تشبیہ استعمال کرتے ہیں' لوگوں کو سمجھاتے ہیں کہ ڈاکٹر کی سی دل سوزی کے ساتھ آپ دعوت کا کام کریں لیکن اگر ڈاکٹر خود ہی دل سوزی سے تہی دامن ہو' تو ہمیں اپنے استعاروں پر نظرثانی کرنا پڑے گی۔ پھر ہم کس کی مثال دیں اور دعوت کے کام کو کس کے ساتھ تشبیہ دیں!

یہ بات بھی ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ جسم کے علاج کے ساتھ ساتھ روح کا علاج بھی ضروری ہے۔ ہاتھ میں گولیاں اور انجکشن تھمانے کے ساتھ ساتھ' اور گوشت کے اُس لوتھڑے کا علاج کرنے کے ساتھ ساتھ کہ جو اُس پورے جسم میں خون پمپ کرتا ہے' اُس لوتھڑے کا علاج بھی ضروری ہے کہ جس کے بارے میں نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اگر وہ ٹھیک ہو جائے' شفایاب ہوجائے تو ساری زندگی کی اصلاح ہو جائے' اور اگر اُس کے اندر بگاڑ اور فساد پیدا ہو جائے تو پوری زندگی کے اندر بگاڑ اور فساد پیدا ہو جائے۔ خوب جان لو' اچھی طرح سن لو کہ یہ دل ہے (بخاری)۔ اور دلوں کی شفا کس چیز میں ہے: اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ○ (الرعد ۲۸:۱۳) ''خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے''، یعنی اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے کہ جس سے دل زندگی پاتے ہیں۔ جسم کے اندر سفید گولیاں بھی اُسی وقت درد و الم کو دُور کرتی ہیں جب اس پر یقین ہو۔ آپ میں سے اکثر اس تجربے سے واقف ہوں گے کہ لوگوں کو خالی سفید پاؤڈر تھما دیا گیا اور اُن میں سے بڑی تعداد کا درد ٹھیک ہو گیا' اس لیے کہ وہ یقین اور اعتماد رکھتے تھے کہ انھیں درد کی گولی دی گئی ہے اور وہ ٹھیک ہو جاتے تھے۔

آدمی حافظے کا نام ہے' کمپیوٹر کا نام ہے جو دل اور دماغ کے اندر آویزاں ہے۔ کمپیوٹر سے آپ حافظے کو غائب کر دیں تو کمپیوٹر ایک دھات کے ٹکڑے سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر دل سے آپ اللہ کی یاد اور ذکر کو محو کر دیں' تو انسان بھی ایک گوشت کا ٹکڑا ہے اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر وہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ اسی لیے فرمایا: وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ط (الحشر ۱۹:۵۹)' یعنی اُن کی طرح نہ ہو جاؤ' جو اللہ کو بھول جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنا آپ بھی بھلا دیتا ہے۔ اس لیے ایک مسلمان معالج ہونے کے ناطے یہ ضروری ہے کہ جسمانی علاج کے ساتھ ساتھ روحانی تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ مریض کا اس کے خالق اور رب کے ساتھ بھی تعلق جوڑا جائے جو فی الواقع بیمار ہونے پر انسان کو شفا بخشتا ہے۔ وہی زندگی اور موت کا مالک ہے اور اسی کے ذکر سے دل زندگی پاتے ہیں اور انسان کو اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ ایک مسلمان معالج' طبیب اور ڈاکٹر محض ایک عام معالج کی طرح نہیں ہے۔ اسے مریض کے ساتھ محض رسمی تعلق نہیں رکھنا چاہیے بلکہ حقیقی معنوں میں ایک ہمدرد' غم خوار' خیر خواہ اور مسیحا کا سا تعلق رکھنا چاہیے۔ اسے محض اس کی جسمانی صحت ہی کا خیال نہیں رکھنا بلکہ روحانی صحت کا بھی خیال رکھنا ہے۔ جہاں اسے مریض کی نبض پر ہاتھ رکھنا ہے وہاں اس کو اس کے رب کے پیغام سے بھی آشنا کرنا ہے۔ رب کے ساتھ اس کا تعلق استوار کرنا ہے تاکہ وہ آخرت میں اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کر کے نجات پا کر جنت میں

داخل ہو جائے۔ مثالی اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے بھی اسے اپنا کردار ادا کرنا ہوگا تا کہ اسلامی انقلاب کی منزل سر ہو سکے۔ اسلامی انقلاب جو مینارۂ نور ہے اور جس کی کسک اور آرزو ہر سینے کے اندر موجود ہے۔

اسی طرح ایک معالج کو ایک مجتہد کا کردار بھی ادا کرنا ہوگا۔ اسلام کی نشات ثانیہ کے لیے' جدید طب کا جو لبرل اور سیکولر بنیادوں پر پروان چڑھی ہے ازسرِنو جائزہ لینا ہوگا اور اسلام کے تصورِ کائنات' تصورِ انسان' تصورِ مرض اور مریض اور تصورِ دوا کے پیش نظر نئی طب کو تشکیل دینا ہوگا۔ اسے آج کے دور کے تقاضوں کے پیش نظر اٹھنے والے علمی مباحث اور نئے مسائل سے بھی باخبر رہنا ہوگا اور اُن کا جدید خطوط پر جواب بھی دینا ہوگا۔

آج کا انسان جو مادہ پرستی' جدید اخلاقی نظریات اور جدید تہذیب و تمدن کی وجہ سے انسانیت' خلوص اور محبت جیسی عظیم نعمتوں سے بڑی حد تک محروم ہوگیا ہے اور اطمینان و سکون کی تلاش میں سرگرداں ہے' اس کے لیے طریق علاج کی اخلاقیات' علاج میں ترجیحات کی اخلاقیات کے ساتھ ساتھ اس کے قلب کی زندگی کی بھی فکر کرنا ہوگی' اور جسم کے علاج کے ساتھ ساتھ روح کا علاج بھی کرنا ہوگا تا کہ وہ اپنے رب کو بھول نہ جائے بلکہ اللہ کا ذکر کرنے والا اور اس کے ذکر سے اطمینان پانے والوں میں سے ہو جائے---!! یہی وہ توقعات ہیں جو ایک مسلمان معالج سے ایک اسلامی معاشرہ' معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے لیے رکھتا ہے۔ یہ منزل یقیناً جہاد اور اجتہاد کے ذریعے ہی طے ہو سکتی ہے! (کیسٹ سے تدوین: امجد عباسی)

محترم خرم مرادؒ کے خطوط

محترم خرم مرادؒ کے خطوط کی ترتیب و تدوین کا کام جاری ہے۔ جن احباب کے پاس ان کے خط محفوظ ہیں' ان سے گزارش ہے کہ اس کام کو ترجیح دے کر اور کچھ وقت نکال کر یہ خطوط تلاش کریں' اصل یا نقل جیسا چاہیں' مجھے ارسال کر دیں۔ میں شکر گزار ہوں گا۔

آپ کے علم میں ہو کہ کسی کے پاس ان کے خط ہیں' تو انھیں توجہ دلا دیں۔

ان خطوط میں سے خیر کی کوئی بات پھیلے گی تو یقیناً بھیجنے والے کو اجر ملے گا۔

مسلم سجاد

منصورہ' لاہور-54570

عرب دنیا: وسائل سے مالا مال' مسائل کی شکار

ترجمہ: مسلم سجاد

ہفت روزہ اکانومسٹ لندن (۶ جولائی ۲۰۰۲ء) نے عرب دنیا کے بارے میں اقوام متحدہ کی رپورٹ کے حوالے سے یہ تحریر شائع کی ہے۔ ہم قارئین کو ایک نقطۂ نگاہ سے آگاہ کرنے کے لیے اسے شائع کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

اقوام متحدہ گذشتہ کچھ عرصے سے مختلف ممالک کے بارے میں انسانی ترقیاتی رپورٹ (Human Development Report - HDR) شائع کرتی ہے۔ لیکن اب پہلی دفعہ ایک علاقے' یعنی عرب دنیا کے بارے میں عرب ایچ ڈی آر ۲۰۰۲ء شائع کی گئی ہے جسے عرب ماہرین ہی نے تیار کیا ہے۔ عرب دنیا سے مراد عرب لیگ کے ۲۲ ممبران ہیں جن کی آبادی اس وقت ۲۸ کروڑ ہے' یعنی تقریباً امریکہ کے برابر' مصر کی ۷ کروڑ سے لے کر قطر کی ساڑھے پانچ لاکھ تک۔ اس علاقے میں نوجوانوں کا تناسب دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ ۳۸ فی صد عرب ۱۴ سال سے کم عمر کے ہیں۔ اندازہ ہے کہ آیندہ ۲۰ سال میں آبادی ۴۰ کروڑ تک ہوجائے گی۔

عرب دنیا کو کیا ہوگیا ہے کہ یہ زمانے سے اتنا پیچھے ہے؟ یہ کوئی بدقسمت علاقہ نہیں' تیل سے مالا مال ہے' اور اس کے عوام ایک قابل فخر مذہبی' تہذیبی اور لسانی ورثے کے مالک ہیں۔ نہ یہ غربت کا شکار ہے' نہ یہاں نسلی تنازعات ہیں۔ استعماریت کے پنجوں سے آزاد ہوئے اسے طویل مدت گزر چکی ہے۔ شاید ہی اس سے کوئی استثنا ہو کہ اس کے مطلق العنان حکمران بادشاہ ہوں یا صدر' مرنے پر ہی اپنے اختیارات سے دستبردار ہوتے ہیں۔ اس کے انتخابات ایک بھونڈا مذاق ہیں۔ نوجوانوں کی نصف آبادی بے روزگاری کا شکار ہے اور جلد از جلد اپنے ممالک سے باہر چلے جانا چاہتے ہیں۔

مراکش سے خلیج تک' خاص طور پر عرب دنیا کے فطری قائد مصر میں عرب دانش ور ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ اتنا برا حال کیسے اور کیوں ہوگیا ہے؟ ایسے ہی دانش وروں کی ایک ٹیم نے اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام (UNDP) کے تحت عرب انسانی ترقیاتی رپورٹ ۲۰۰۲ء شائع کی ہے۔ عرب دنیا میں آزادی

اظہار پر جو پابندیاں ہیں اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ عرب دنیا میں کوئی قابل ذکر مرکز علم و دانش (think tank) نہیں ہے۔ ایک مصری نادر فرغانی اس رپورٹ لکھنے والی ٹیم کا سربراہ ہے۔ رپورٹ میں عرب دنیا کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا بہت احتیاط سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ کامیابیاں بہت کم جگہ میں آگئی ہیں۔ اصل موضوع ناکامیاں ہیں۔ انھوں نے نام لینے میں احتیاط کی ہے لیکن دیانت داری سے بتایا ہے کہ عرب دنیا پر کیا بپتا پڑ رہی ہے۔

انسانی ترقیاتی رپورٹ میں' متوقع اوسط عمر' اسکولوں میں طلبہ کی تعداد' شرح خواندگی اور فی کس آمدنی کی بنیاد پر اندازہ لگایا جاتا ہے۔ یہ پہلی رپورٹ ہے جو ایک پورے علاقے کے بارے میں آئی ہے۔ آیندہ سالانہ رپورٹ پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ یہ عمومی رپورٹ ہے۔ اس کے بعد خصوصی موضوعات پر رپورٹیں پیش کی جائیں گی' مثلاً ''انفارمیشن ٹکنالوجی میں عرب کیوں پیچھے رہ گئے؟''

یقیناً کچھ خوش گوار باتیں بھی ہیں۔ گذشتہ تین عشروں میں اوسط عمر میں ۱۵ سال کا اضافہ ہوا ہے۔ نوزائیدہ بچوں کی اموات دو تہائی کم ہوگئی ہیں۔ یہ کوئی بتانے کی بات نہیں ہے کہ دوسرے ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں عرب دنیا میں فی کس آمدنی زیادہ ہے۔ لیکن یہ بات تعجب خیز ہے کہ اس کی مجموعی قومی پیداوار ۵۳۱ ارب ڈالر ہے جو اسپین سے کم ہے۔ عربوں میں ایک ڈالر روز سے کم آمدنی والی شدید غربت کسی دوسرے ترقی پذیر ممالک سے کم ہے اور یہ شاید ناداروں کی مدد کرنے کی اسلامی اور عربی روایت کا ثمرہ ہے۔ لیکن رپورٹ کے مطابق علاقہ ترقی یافتہ کم' اور امیر زیادہ ہے۔

اب بھی پانچ میں سے ایک عرب باشندہ دو ڈالر سے کم آمدنی پر گزارا کرتا ہے۔ گذشتہ ۲۰ سال میں فی کس آمدنی میں ۰.۵ فی صد کے حساب سے اضافہ ساری دنیا کے مقابلے میں کم تر ہے۔ اس حساب سے ۱۴۰ برسوں میں ایک عرب اپنی آمدنی دگنی کر سکے گا۔ یہ ہدف بعض دوسرے ملک ۱۰ سال میں حاصل کرنے والے ہیں۔

پیداوار میں جمود اور آبادی میں اضافے کا مطلب ہے بے روزگاری۔ ایک کروڑ ۲۰ لاکھ روزگار کے قابل افراد کا ۱۵ فی صد بے روزگار ہے۔ ۲۰۱۰ء تک یہ تعداد ڈھائی کروڑ تک پہنچ سکتی ہے۔

عربوں کی کارکردگی میں رکاوٹ وسائل کی کمی نہیں ہے۔ رپورٹ کے مطابق' اس کا سبب تین بنیادی امور کی کمی ہے: ایک' آزادی۔ دوسرے' علم۔ تیسرے' طاقت نسواں (womanpower)۔

رپورٹ کے مطابق' ان تین خامیوں کی وجہ سے احساس محرومی کے شکار عرب اپنی امکانی کامیابیاں حاصل نہیں کر پا رہے اور اس لیے باقی دنیا ان سے دولت اور پس ماندگی کے مہلک امتزاج کی وجہ سے نفرت کرتی ہے اور خوف کھاتی ہے۔

آزادی

عرب دنیا میں جو بنیادی خامیاں ہیں اس کے اسباب یہ ہیں: مطلق العنان حکومتوں کا تسلسل' بدعنوانی پر مبنی انتخابات' انتظامیہ اور عدلیہ کے اختیارات میں الجھاؤ' ذرائع ابلاغ اور سول سوسائٹی پر پابندیاں اور ایک غیر روادار' گھٹن زدہ ماحول۔ گو جمہوریت کے دکھاووں میں یہ خطہ بہت آگے ہے۔ یہاں انتخابات کا انعقاد ہوتا ہے' انسانی حقوق کے کنونشن پر دستخط بھی ہوتے ہیں لیکن انسانی حقوق کی لہر نے گذشتہ ۱۵ برس میں دنیا کے بہت سے حصوں کو جس طرح کھول کر رکھ دیا ہے عربوں کو یہ چھو کر بھی نہیں گزری۔ کبھی کبھار جمہوریت کی پیش کش کی جاتی ہے لیکن ایک حق کے طور پر نہیں' احسان کے طور پر۔

رپورٹ میں بڑے شائستہ انداز میں کہا گیا ہے: بیلٹ بکس کے ذریعے انتقال اقتدار عرب کا عام طریقہ نہیں ہے۔ وزرا اور سرکاری ملازم شاذ ہی میرٹ پر مقرر کیے جاتے ہیں۔ مناصب اس بنیاد پر نہیں ملتے کہ آپ کیا جانتے ہیں بلکہ اس بنیاد پر ملتے ہیں کہ آپ کس کو جانتے ہیں۔ اس کا نتیجہ عوام سے بے تعلق' بے حرکت' مرکزی اتھارٹی اور ایک نااہل انتظامیہ ہے۔

آزادی اظہار اور آزادی اجتماع پر سخت پابندیاں ہیں۔ رپورٹ میں ایک امریکی مانیٹرنگ ادارے کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ کسی عرب ملک میں بھی حقیقی مفہوم میں آزاد میڈیا نہیں ہے۔ صرف تین میں جزوی آزادی ہے' باقی آزاد نہیں ہیں۔

علم

امام علی بن ابی طالب نے چھٹی صدی میں یہ فرمایا تھا کہ ''اگر اللہ تعالیٰ کسی انسان کی تحقیر کرنا چاہے تو اسے علم سے محروم کر دیتا ہے''۔ عرب تعلیم پر کسی بھی دوسرے ترقی پذیر ملک کے مقابلے میں مجموعی قومی پیداوار کا زیادہ فی صد خرچ کرتے ہیں لیکن محسوس ہوتا ہے کہ یہ صحیح خرچ نہیں کیا جاتا۔ تعلیم کا معیار قابل رحم حد تک گرا ہوا ہے۔ لیبر مارکیٹ اور تعلیمی نظام میں کوئی رابطہ نہیں ہے۔ ناخواندگی کی شرح میں کمی ہوئی ہے لیکن پھر بھی بہت زیادہ ہے۔ ساڑھے چھ کروڑ افراد ناخواندہ ہیں جن میں سے دو تہائی خواتین ہیں۔ ایک کروڑ بچوں کو اسکول نصیب نہیں ہوتا۔ اس ناقص تعلیم کا سنگین نتیجہ یہ ہے کہ عرب' جنھوں نے کبھی سائنس کی قیادت کی تھی' آج سائنسی تحقیق اور انفارمیشن ٹکنالوجی میں بہت پیچھے چلے گئے ہیں۔ تحقیق و ترقی میں سرمایہ کاری دنیا کے اوسط کا ساتواں حصہ ہے۔ آبادی کا ۰.۶ فی صد انٹرنیٹ استعمال کرتا ہے اور ۱.۲ فی صد کے پاس ذاتی کمپیوٹر ہے۔ اس کا ایک نتیجہ تخلیقی سرگرمی میں کمی ہے۔ نئے لکھنے والے کم سامنے آرہے ہیں۔ فلموں میں بھی زوال ہے۔ غیرملکی کتابوں کے ترجمے بھی نہیں کیے جارہے۔ خلیفہ مامون کے ایک ہزار سال پہلے کے دور سے لے کر اب تک

عرب دنیا میں جتنے ترجمے ہوئے ہیں' اتنے اسپین صرف ایک سال میں کر لیتا ہے۔

عورت کا مقام

عرب دنیا میں عورت کو ایک مکمل شہری تصور نہیں کیا جاتا۔ رپورٹ کے مطابق یہ انسانی وسائل کا بہت بڑا ضیاع ہے۔ اگر آدھی آبادی کا گلا گھونٹ دیا جائے تو وہ ملک کیسے خوش حال ہو سکتا ہے؟ گذشتہ ۳۰ برس میں خواتین کی خواندگی کی شرح میں تین گنا اضافہ ہوا ہے لیکن اب بھی ہر دو میں سے ایک عرب عورت نہ لکھ سکتی ہے اور نہ پڑھ سکتی ہے۔ ملک کے سیاسی و معاشرتی معاملات میں ان کی شرکت اب بھی دنیا میں سب سے کم ہے۔

حکومتیں اور معاشرے دونوں کے خواتین کے ساتھ سلوک اور رویے میں فرق ہے۔ تمام عرب ممالک میں خواتین کو غیر مساوی شہری اور قانونی حقوق کا سامنا ہے۔ عورتوں کے بارے میں اعداد و شمار ۲۲ میں سے صرف ۱۴ ممالک سے مل سکے ہیں۔ یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ عورتوں کے بارے میں ایک عمومی لاپروائی کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔

یہ ایسا سب کچھ کیوں ہو گیا؟ اس کے کوئی واضح تاریخی اسباب نظر نہیں آتے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ترجیح اس بات کی تھی کہ مغربی ممالک کی حکمرانی سے نجات حاصل کی جائے جو براہ راست یا بالواسطہ حکومت کر رہے تھے۔ زور قومی آزادی پر تھا' فرد کی آزادی پر نہیں۔ لیکن جب استعماری طاقتیں چلی گئیں تو بھی نئی آزاد حکومتوں نے اختیارات کی تقسیم اور سرپرستانہ رویہ اپنانے میں سابقہ استعماری حکومتوں کی نقالی کی اور مغرب کی تقلید جاری رکھی۔ انور سادات تو مصری عوام کو میرے بچو! کہہ کر خطاب کرتے تھے۔

اس جائزے کے عرب مصنفین نے علاقے کی ناکامیوں کے لیے عرب اسرائیل تنازعے کو سبب یا عذر کی حیثیت سے پیش کرنے سے احتراز کیا ہے۔ رپورٹ میں فلسطینی مہاجروں کا ذکر کیا گیا ہے اور ایک خصوصی حصے میں پورے علاقے کی سیاسی اور معاشی زندگی پر اس کے شدید اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بلاشبہہ اسرائیل سے تعلقات خصوصاً اس کا فلسطین پر قبضہ اصل امور سے توجہ بالکل ہٹا دیتا ہے۔ اس پر وسائل اور توانائیاں صرف ہو رہی ہیں اور مزید یہ ہے کہ عوام کی فکر کا محور انفرادی آزادی کے بجائے قومی آزادی کی طرف مڑ جاتا ہے۔

سرد جنگ کے زمانے میں علاقے کی پریشانیوں کے لیے بیرونی مداخلت کو الزام دینے کا فیشن تھا۔ ب اس کا فیشن تو نہیں رہا لیکن اب بھی اس کا جواز ہے مثلاً ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد' بیرونی واقعات نے ...لق العنان حکمرانوں کو بعض گھناؤنے اقدام کرنے کا جواز فراہم کر دیا ہے خصوصاً اگر یہ حریف اسلامی گروپوں ... ساتھ کیے جائیں۔ اس وقت شام میں القاعدہ کے ایک رہنما کو امریکہ کی رضامندی اور حوصلہ افزائی سے

شدید ٹارچر کیا جارہا ہے۔

رپورٹ میں ممالک کو الگ الگ زیر بحث نہیں لایا گیا ہے' عمومی بات کہی گئی ہے' مثلاً سیکولر تیونس اور اسلامی سعودی عربیہ کے بارے میں صرف یہ ذکر ہے کہ وہ اختلاف کو برداشت نہ کرنے کے بارے میں یکساں ہیں۔ کویت اور قطر میں میں نسبتاً آزاد انتخابات ہوئے ہیں۔ اُردن اور مصر میں مرد عورت مساوات کی طرف قدم بڑھائے گئے ہیں۔

سب سے نازک سوال جس سے مصنفین رپورٹ احتیاط سے دامن بچا کر گزر گئے ہیں یہ ہے کہ عرب دنیا کے دانش ور جس نشات ثانیہ کی تمنا رکھتے ہیں اس کی طرف پیش قدمی میں رکاوٹ ڈالنے اور تاخیر کرنے میں' اسلام نے کیا کردار ادا کیا ہے؟ رپورٹ کا ایک مکمل مقالہ عدل' امن' رواداری' توازن اور تمام اچھی باتوں کے لیے اسلام کی حمایت کو بیان کرتا ہے۔ لیکن بیش تر سیکولرسٹوں کو یہ یقین ہے کہ ۸۰ء کے عشرے اور ۱۹۹۰ء کے ابتدائی عشرے کی خوف ناک عسکریت کی جگہ جس اسلامیت نے نفوذ کیا ہے' اس نے تعمیری عرب فکر کو پنپنے کا موقع نہیں دیا۔

عربوں کو ان کے اسکول کے دنوں سے بتایا جاتا ہے کہ انھیں روایت سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔ انھیں بزرگوں (authority) کا احترام کرنا چاہیے اور سچ کی تلاش کتاب میں کرنا چاہیے نہ کہ تجربے میں۔ فساد اور فتنے کا خوف عرب اسلامی تعلیمات میں گہری جڑیں رکھتا ہے۔ ایک شامی دانش ور کے مطابق: ''فکر کا کردار تشریح کرنا اور منتقل کرنا ہے۔ تلاش کرنا اور سوال کرنا نہیں ہے''۔

اس طرح کے تصورات نے ازمنۂ وسطی کے عرب ماہرین فلکیات اور ریاضی کی راہ کھوٹی نہیں کی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کا راج ہے۔ تنقیدی فکر اور اختراع کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے' نتیجہ یہ ہے کہ ایسے نوجوان عربوں کی فوج تیار ہو رہی ہے جو بے روزگار ہے اور جمہوری ذرائع سے اپنے معاشروں کو بدلنے سے لاتعلق ہے۔ اسلام انھیں کم سے کم عزت نفس کا ایک احساس دیتا ہے۔ ان کے لیے سب دروازے بند ہیں۔ ان میں سے کچھ اپنا خطرناک غم و غصہ مغربی دنیا پر اُتار رہے ہیں۔

اخبارِ اُمت

دینی تعلیم یا نصاب‘ اور امریکی مطالبے

عبدالغفار عزیز ○

۲۵ اگست ۱۹۸۱ء کو صہیونی وزیراعظم بیگن مصر کے دورے پر گئے‘ مصر اسرائیل تعلقات میں بہتری زیربحث تھی۔ بیگن نے انورالسادات کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا: ”میں آپ کی اس بات پر کیسے یقین کرلوں کہ آپ ہمارے ساتھ واقعتاً دوستی چاہتے ہیں‘ جب کہ آپ کے طلبہ کو اب بھی اس قرآنی آیت کی تعلیم دی جاتی ہے کہ لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ط (المائدہ ۵:۷۸) ”بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤدؑ اور عیسٰیؑ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی“۔ صدر سادات نے اپنے وزیرتعلیم کو طلب کیا اور حکم دیا کہ مصری تعلیمی اداروں میں پڑھائی جانے والی ایسی تمام آیات کو نصاب سے خارج کر دیا جائے جن میں یہودیوں کی دشمنی کا ذکر ہو۔

۶ جولائی ۲۰۰۲ء کے اخبار الشرق الاوسط (عالم عرب کا سب سے بڑا اخبار) میں سابق مصری وزیراعظم مصطفیٰ خلیل کا ایک بیان شائع ہوا ہے‘ جس میں انھوں نے اعتراف کیا کہ کیمپ ڈیوڈ معاہدے سے پہلے امریکہ نے انورالسادات سے مطالبہ کیا تھا کہ ”اسرائیل کے ساتھ تعلقات استوار کرنے سے پہلے تمھیں دور رس تبدیلیاں لانا ہوں گی“۔ مصطفیٰ خلیل نے یہ وضاحت بھی کی کہ ”میری زیرنگرانی ایک اصلاحاتی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ کمیٹی نے معاشرتی‘ اقتصادی اور سیاسی اصلاحات کے لیے جامع سفارشات پیش کیں‘ جو مرحلہ وار نافذ ہوئیں“۔

اصلاحات کے نام پر صہیونی‘ امریکی خواہشات کی تعمیل و تکمیل کا سفر اب بھی جاری ہے۔ مصر ہی نہیں‘ مراکش سے ملایشیا تک اکثر و بیشتر مسلم ممالک اسی کولھو میں جتے ہوئے ہیں۔ ”اصلاحات“ کا دائرہ بھی بہت

○ ڈائرکٹر‘ امور خارجہ‘ جماعت اسلامی پاکستان

وسیع ہو چکا ہے' لیکن ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد جس پہلو پر زیادہ توجہ اور زیادہ وسائل صرف کیے جا رہے ہیں' وہ تعلیم ہے۔ پاکستان' سعودی عرب اور یمن پر اس حوالے سے خصوصی عنایات کی جا رہی ہیں۔ یہ بات تکرار سے دہرائی جا رہی ہے کہ ان ممالک کے نصاب تعلیم اور خاص طور پر دینی مدارس کے نصاب' دہشت گردی کی آبیاری کرتے ہیں۔ پاکستان کے دینی مدارس سے طالبان اور ان کے حامی جنم لیتے ہیں اور سعودی عرب و یمن کے مدارس سے القاعدہ اور اس کے مددگار۔ ملک سے غربت کے خاتمے اور اقتصادی ترقی کے لیے کوئی ''مونگ پھلی'' عطا ہو یا نہ ہو' تعلیم کو درست کرنے کے لیے ۱۰۰ ملین ڈالر حاضر ہیں۔

پاکستان میں تعلیمی اداروں اور تعلیمی نصاب میں کیا کیا تبدیلیاں مطلوب ہیں ان کا ایک اندازہ دیگر مسلم ممالک' خاص طور پر مصر سے کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان اور دیگر مسلم ممالک پر جو عنایات اب شروع ہوئی ہیں' مصر پر ۱۹۷۹ء سے شروع ہیں۔ اس وقت سے اب تک مصر سے جو مطالبات کیے گئے' اس تحریر کے شروع میں ''بیگن سادات مکالمہ'' ان کا ایک مظہر ہے۔ ان کا بس چلتا تو ان آیات و احکام کو قرآن کریم ہی سے خارج کروا دیتے لیکن انا لہ لحافظون کے سامنے ان کا بس نہیں چلتا' اس لیے اب وہی پٹا ہوا طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے: وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ○ (حم السجدہ ۴۱:۲۶) ''یہ منکرین حق کہتے ہیں ''اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو' شاید کہ اسی طرح تم غالب آ جاؤ''۔

اس ضمن میں جن متعدد آیات و احادیث کو نصاب تعلیم سے خارج کیا گیا ہے وہ جہاد' یہودیوں کی مسلم دشمنی' کفار سے محبت و دوستی کی ممانعت اور حجاب و حیا سے متعلق ہیں۔ ان کے علاوہ وہ آیات و تعلیمات بھی خارج از نصاب کر دی گئیں جن میں خوف آخرت یا برائیوں کے بدانجام کا ذکر ہے۔

تل ابیب یونی ورسٹی میں انھی دنوں ایک سیمی نار منعقد کیا گیا جس میں مصری وزیراعظم مصطفیٰ خلیل اور بطرس غالی بھی شریک ہوئے۔ سیمی نار کا عنوان تھا: دراسة تاثیر القرآن فی عرقلة التطبیع مع اسرائیل ''اسرائیل سے تعلقات استوار کرنے میں حائل قرآنی اثرات کا جائزہ''۔ اس سیمی نار میں صہیونی وزیراعظم نے مصری حکومت سے مطالبہ کیا کہ ''قرآنی تعلیمات دینے والے مراکز بند کیے جائیں اور مساجد کو براہ راست حکومتی تحویل میں لے لیا جائے''۔

یہی پالیسی تھی جس کے تحت عالم اسلام کی سب سے نامور یونی ورسٹی جامعہ الازہر کو سرکاری تحویل میں لیا گیا۔ جامعہ کو اپنے وقف اثاثوں سے محروم کرتے ہوئے وزارت اوقاف کے اختیار و انتظام میں دے دیا گیا۔ شیخ متولی شعراوی جو گذشتہ برس اللہ کو پیارے ہو گئے اور جو اپنے دروس قرآن کی وجہ سے پوری مسلم دنیا میں

بلند مقام رکھتے تھے' اُس وقت جامعہ ازہر کے سربراہ حسن مامون کے ناظم دفتر تھے۔ اپنے ایک دوست کمال حبیب کو بتاتے ہیں کہ "شیخ الازہر حسن مامون کو اس قدر بے دست و پا کر دیا گیا تھا کہ وہ اپنا بستر بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں کر سکتے تھے"۔

ازہر میں تعلیم کا عرصہ کم کر دیا گیا' مختلف فقہی مذاہب پڑھانے سے منع کر دیا گیا۔ غیر مصری طلبہ کا داخلہ تقریباً ناممکن بنا دیا گیا۔ ازہر کی ابتدائی تعلیم میں داخلے کے لیے عمر کی حد بڑھا دی گئی تاکہ اس انتظار میں رہنے کے بجائے طلبہ دوسرے تعلیمی اداروں میں کھپ جائیں۔ قرآن کریم تعلیم کی اصل بنیاد تھا' اس کی تعلیم محدود کر دی گئی۔ اس پورے "اصلاحی عمل" کو وہاں "علمنة الازہر" کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے' یعنی ازہر کو سیکولر کرنا۔

مصر کے تعلیمی نصاب اور اس میں چھپی بنیاد پرستی پر' کس کس طرح اظہار تشویش کیا گیا' صرف ایک مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک ماہر تعلیم آٹھویں کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: "اسی طرح آٹھویں کی عربی کی کتاب مطبوعہ ۹۲-۱۹۹۱ء کا ایک مضمون ملاحظہ ہو' عنوان ہے: "عرب خاتون"۔ اس مضمون میں رسول کریمؐ کی ازواج کا ذکر بڑی مبالغہ آمیزی اور ستایش و تمجید سے کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہزاروں سال پر پھیلی ہماری تاریخ میں سے ہمیں کوئی اور مثال نہیں ملتی؟ کیا فرعونی اور قبطی تاریخ میں سے دیگر خواتین کی مثالیں نہیں دی جا سکتی تھیں کہ جن سے ایک توازن قائم ہو جاتا"۔ (شبل بدران: المؤسسة التعليمية والتطرف' مجلة التربية المعاصرة' ۱۱ مارچ ۱۹۹۶ء' ص ۳۱۸-۳۱۹)

یہی صاحب اپنے اسی تجزیے میں لکھتے ہیں: "اسلام کے نام پر' مختلف دینی اداروں اور تنظیموں کے زیر اہتمام مدارس کے قیام کی اجازت نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ان تعلیمی اداروں میں طلبہ اور اساتذہ کا چناؤ صرف اور صرف دینی بنیادوں پر ہوتا ہے"۔

ان تجزیوں' سفارشات اور تعلیمی پالیسیوں کے نتیجے میں عملاً جو تبدیلیاں وقوع پذیر ہو چکی ہیں' ان کی چند مثالیں یہ ہیں:

—— سورۂ نور کی یہ آیت حذف کر دی گئی: "اے نبی مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں"۔ اسی طرح سورۂ مجادلہ کی یہ آیت حذف کر دی گئی: "تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کی ہے"۔

—— پورے نصاب تعلیم میں سے ہر وہ بات نکالنے کی کوشش کی گئی جس میں طالب علم کے ذہن

میں اپنے خالق' دین یا اہل دین کا مقام اجاگر ہو۔ یہ معروف حدیث بھی حذف کر دی گئی: ''تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے''۔ یہ حدیث بھی خارج کر دی گئی: ''مسواک کرو کہ اس سے منہ صاف ہوتا ہے اور رب راضی ہوتا ہے''۔

—— ایک جملہ تھا: ''میں جب کسی کے پاس سے گزرتا ہوں تو انھیں السلام علیکم کہتا ہوں'' اسے تبدیل کر کے یوں لکھ دیا گیا: ''میں جب کسی کے پاس سے گزرتا ہوں تو انھیں آداب بجالاتا ہوں''۔

—— سورج پر ایک مضمون میں جملہ تھا: ''سورج سے ہمیں نمازوں کے اوقات متعین کرنے میں بھی مدد ملتی ہے''، اسے حذف کر دیا گیا۔

—— بچوں کی نظموں میں سے وہ تمام نظمیں نکال دی گئیں جن میں اسلامی تعلیمات تھیں' مثلاً:

بنی توضا وقم للصلاہ وصل لربك تكسب رضاہ

بیٹے! اُٹھو وضو کرو' نماز پڑھو اور اپنے رب کی رضا حاصل کرو۔

رباہ انت خلقتنی ومنحتنی سر الحیاۃ

پروردگار تو نے مجھے پیدا کیا اور زندگی کے راز سے آشنا کیا۔

—— رسول اکرمؐ کی سیرت میں سے آپؐ کی غزوات و جہاد کا ذکر حذف کر دیا گیا۔

—— انٹرمیڈیٹ کے نصاب سے حضرت عمرؓ کی سیرت پر کتاب بجٹ کم ہونے کے عذر پر نکال دی گئی۔

—— عربی زبان سکھانے کے لیے آیات' احادیث اور اخلاقی تعلیمات پر مبنی اشعار پر مشتمل کتاب خارج کر کے ایسی باتصویر اور رنگین کتب لائی گئی ہیں جن میں جنسی تعلیمات و تصاویر کی بھرمار ہے۔

حذف و اضافے کا یہ ذکر بہت طویل ہو سکتا ہے کیونکہ کوئی تعلیمی درجہ یا کتاب ایسی نہیں چھوڑی گئی جس میں تبدیلی نہ لائی گئی ہو۔ خود مصر کی تاریخ میں اسرائیل کے ساتھ جنگوں کا ذکر مختصر اور بہت محتاط الفاظ میں کیا گیا ہے۔ نقشے میں سے فلسطین کا نام نکال کر اسرائیل درج کر دیا گیا ہے۔ اسرائیل کے ساتھ امن معاہدے کے گیت گائے گئے ہیں اور جو ملک کیمپ ڈیوڈ معاہدے پر معترض تھے ان کے متعلق لکھا گیا ہے کہ ''جو ممالک عالمی تبدیلیوں کو سمجھنے سے قاصر تھے انھوں نے اس معاہدے کو قبول نہیں کیا۔ ترقی یافتہ ممالک نے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا''۔

مصر کا ذکر چھوڑتے ہوئے آیئے چند دیگر ممالک کی جھلک دیکھتے ہیں:

۲۱ نومبر ۲۰۰۱ء کو جاری ہونے والی ایک امریکی رپورٹ میں فلسطینی اتھارٹی کی تعلیمی پالیسی کا جائزہ لیا

گیا ہے۔ رپورٹ میں اس امر پر گہری تشویش کا اظہار کیا گیا ہے کہ فلسطینی اسکولوں کے نصاب میں یہودیوں کے کسی مقدس مقام کا ذکر تک نہیں ہے۔ القدس کو یوں ظاہر کیا گیا کہ گویا اس پر صرف فلسطینیوں ہی کا حق ہے‘ شہدا اور جہاد کا تقدس ذہنوں میں بٹھایا جاتا ہے۔ اسرائیل کے ساتھ صلح کی اہمیت کا ذکر کافی نہیں ہے۔ فلسطینی اتھارٹی نے اپنی تعلیمی پالیسی میں یونیسکو کے طے کردہ تعلیمی اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھا۔

فلسطینی اتھارٹی اپنے دینی وملّی فرائض کی کس حد تک پاس دار ہے اور امن کے سراب کے پیچھے دوڑتے دوڑتے‘ ملّی مفادات سے دست برداری کے کس جہنم میں خود کو اور فلسطینی قوم کو جھلسا رہی ہے‘ یہاں اس کے ذکر کا موقع نہیں ہے لیکن آیئے دیکھیں یونیسکو کے جن تعلیمی اصولوں کی دہائی دی گئی ہے وہ کیا ہیں؟

یونیسکو کے زیر انتظام قائم کردہ ایک ادارہ ''اسلام اور مغرب'' اپنے دستور مجریہ ۳ اکتوبر ۱۹۷۹ء میں لکھتا ہے: ''درسی کتب کے مولفین کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ دین کو کسی چیز کا معیار یا ہدف بنا کر پیش کریں۔ صرف انھی دینی امور کو تعلیمی نصاب میں شامل ہونا چاہیے جو دیگر ادیان میں بھی مشترک ہوں۔ درسی کتب میں مذکور دینی مظاہر کا باریک بینی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اس جائزے میں دوسرے عقائد رکھنے والے بلکہ لادین افراد کو بھی شریک کرنا چاہیے''۔ (جمال عبدالہادی اور دیگر‘ تطویر ام تضلیل فی مناهج التربیة الاسلامیة‘ ص ۳۶)

سعودی عرب کے تعلیمی نظام کو تو اس شدت سے نشانہ تنقید بنایا جا رہا ہے کہ امریکی اخبارات اور دانش ور حلقوں کے علاوہ امریکی کانگریس تک میں اس کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔ کہا گیا کہ‘ دہشت گردی کے خلاف جنگ صرف افغانستان پر حملے سے نہیں جیتی جاسکتی‘ وہاں موجود عناصر تو صرف ایک مظہر ہیں۔ دہشت گردی کی اصل جڑیں سعودی عرب اور اس کے تعلیمی نظام میں ہیں۔ پھر مزید وجوہات بیان کرتے ہوئے دریدہ دہن یہاں تک پہنچے کہ ''حرمین کا وجود دہشت گردی کا سبب ہے اور آسان حل یہ ہے کہ (نعوذ باللہ) مکہ پر ایک ایٹم بم گرا دیا جائے''۔

الجزیرہ چینل کے ایک معروف ہفتہ وار پروگرام میں اسی مسئلے کا جائزہ لیا گیا (۱۶ جنوری ۲۰۰۲ء)۔ پروگرام پروڈیوسر احمد منصور معروف امریکی صہیونی تجزیہ نگار تھامس فرائڈمین کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے: ''۱۲ دسمبر کے نیویارک ٹائمز میں تھامس فرائڈمین لکھتا ہے کہ دینی مدارس اور جامعات ہی دہشت گردی کا گڑھ ہیں۔ یہیں سے دہشت گردوں کے لیڈر پیدا ہوئے۔ دہشت گردی کے انھی سوتوں کو خشک کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ یہی تعلیم یہود و نصاریٰ کے خلاف نفرت پھیلاتی ہے۔ اب یہ بازگشت بھی سنائی دے رہی ہے کہ سعودی عرب اور دیگر عرب ملکوں میں نصاب تعلیم تبدیل کیے جا رہے ہیں۔ اسرائیل دباؤ

ڈال رہا ہے کہ وہ قرآنی آیات پڑھے جانے یا ریڈیو اور ٹی وی پر پیش کرنے پر پابندی لگا دی جائے جن میں یہود کا ذکر ہے۔ یہ مہم ہمارے دین، ہماری ثقافت، ہماری تاریخ اور سب کچھ تبدیل کرنے کے لیے ہے" (الجزیرہ نٹ)۔

الجزیرہ ہی کے ایک اور پروگرام میں ''سعودی عرب پر امریکی دباؤ'' کے حوالے سے بحث ہوئی (۱۰ جولائی ۲۰۰۲ء)۔ اس میں حصہ لینے والوں میں سعودیہ کے وہ تین معروف علماے کرام بھی تھے، جو عراق کویت جنگ کے بعد سعودیہ میں امریکی افواج کی آمد کے خلاف تھے۔ اس مخالفت کے باعث انھیں ۱۵، ۱۵ سال کی سزا سنا دی گئی تھی، لیکن بعد میں رہا کر دیا گیا۔ ان میں سے ایک عالم دین شیخ سفر الحوالی کی گفتگو کے چند جملے: ''جو امر اس اُمت کے کسی فرد کے لیے قابل قبول نہیں ہے، نہ کوئی اس سے تغافل ہی برت سکتا ہے وہ جزیرہ عرب سے امریکہ کی دشمنی ہے۔ جزیرہ عرب کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی بات ہے، یہاں کے نظام تعلیم کو تبدیل کر دینے کی بات ہے، یہاں دعوتی سرگرمیوں کو کچل دینے کی بات ہے...... لیکن امریکہ کو جان لینا چاہیے کہ سعودی عرب میں ایسا کر کے وہ آگ سے کھیل رہا ہے''۔ (پورا متن الجزیرہ نٹ پر)

۱۶ جولائی ۲۰۰۲ء کو یمن سے یہ اطلاعات موصول ہوئیں کہ تعلیمی وحدت کے نام پر یمنی حکومت نے تمام پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو قومیانے کا عمل شروع کر دیا ہے۔ اس کوشش میں کئی مقامات پر پولیس اور مقامی آبادیوں کے درمیان جھڑپیں بھی ہوئی ہیں۔ کئی مدارس کے اندر شہریوں نے دھرنا دے دیا کہ پولیس کو ان پر قبضہ نہیں کرنے دیں گے۔

اسی مہینے مراکش سے یہ خبریں آئی ہیں کہ مراکشی پولیس نے ۱۶ علما اور دانش وروں کو گرفتار کر لیا۔ ان پر الزام تھا کہ وہ امریکہ کے خلاف نفرت کی تعلیم دیتے تھے۔

پاکستان ہی نہیں پوری مسلم دنیا کا ایک ہی مسئلہ ہے اور وہ ہے نصاب تعلیم کی تبدیلی۔ نظام و نصاب میں بہتری کسے مطلوب نہیں ہے۔ خود دینی مدارس سے یہ آواز گاہے بگاہے اٹھتی ہے کہ تعلیمی اصلاحات متعارف کروائی جائیں اور تمام تعلیمی اداروں کو تیز رفتار دنیا کا ساتھ دینے کے قابل بنانے کی فکر کی جائے۔ لیکن اگر تمام جدوجہد کا مقصد امریکہ کی خوشنودی اور امریکہ و اسرائیل سے قربت اور آیندہ نسلوں کو دین بیزار بنانا ہو، تو ایسا کرنے سے پہلے ۱۰ دفعہ سوچنا ہوگا۔

یہ معلومات بھی دل چسپی کا باعث ہوں گی کہ مسلمان نسلوں سے قرآن و سنت چھیننے کی کوشش کرنے والے اپنے بچوں کو مذہب کے حوالے سے کیا تعلیم دے رہے ہیں۔ اسرائیل میں پرائمری سطح پر تعلیم حاصل کرنے والوں کی ۳۱ فی صد تعداد دینی مدارس میں زیر تعلیم ہے جن میں سے ۲۱.۶ فی صد سرکاری سرپرستی میں چلنے والے مدارس اور ۹.۹ فی صد آرتھوڈکس یہودی دینی جماعتوں کے مدارس میں زیر تعلیم ہیں۔ اسرائیلی

وزارت تعلیم کے اعداد و شمار کے مطابق گذشتہ عشرے کے دوران یہودی دینی مدارس میں داخلہ لینے والے طلبہ کی تعداد میں ۱۳۰ فی صد اضافہ ہوا ہے۔

اسرائیلی اخبار یدیعوت احرونوت کے مطابق ۱۹۹۰ء میں یہودی دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد ۴۸ ہزار تھی جو ۲۰۰۰ء میں ایک لاکھ ۱۱ ہزار ہوگئی ہے۔ اسی عرصے میں صرف توراتی قوانین پڑھنے والوں کی تعداد ۱۷ ہزار سے بڑھ کر ۳۲ ہزار ہوگئی ہے۔ پرائمری اسکول ہی سے دینی تعلیم اور عبرانی زبان سکھانے کا عالم یہ ہے کہ چوتھی کلاس تک کے بچوں کو عام اسکولوں میں ۳۵ فی صد وقت اور دینی مدارس میں ۵۱ فی صد وقت یہی دو مضامین پڑھانے پر صرف کیا جاتا ہے۔

پہلے اسرائیلی وزیراعظم بن گوریون نے ۱۹۵۶ء میں چوبیسویں صہیونی کانفرنس میں کہا تھا: ''صہیونی تحریک کا کوئی مستقبل نہیں ہوگا اگر ہر یہودی عبرانی تربیت و ثقافت پھیلانا اپنا فرض عین نہ سمجھے''۔

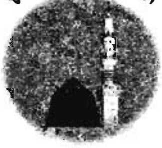
کیا بن گوریون کے ان الفاظ میں عالم اسلام کے لیے بھی کوئی پیغام ہے......؟ کوئی تازیانہ ہے---؟

(ماخذ: البیان' الشرق الاوسط : لندن' المجتمع: کویت' الامان: لبنان' الجزیرہ نٹ اور اسلام آن لائن)

دیارِ حبیب کا سفر



الحبیب ٹورز کے ساتھ



حج عمرہ و زیارات

کفایت اور معیار ساتھ ساتھ

- ★ تربیت کا مکمل نظام
- ★ مناسک حج و عمرہ سے مکمل آگاہی
- ★ بہترین اور معیاری رہائش گاہ
- ★ حرمین شریفین سے نزدیک ترین رہائش
- ★ زیارات مقامات مقدسہ کا بہترین انتظام
- ★ ایئرپورٹ سے واپس ایئرپورٹ تک بہترین ایئرکنڈیشنڈ ٹرانسپورٹ
- ★ دیگر شہروں میں جانے کے لئے خصوصی پاس
- ★ پاکستانی کھانوں کا اہتمام

زیارات

گروپس کے لئے اضافی سہولیات

عراق: حضرت آدمؑ۔ حضرت نوحؑ۔ حضرت یونسؑ۔ حضرت ہودؑ۔ حضرت ایوبؑ۔ حضرت صالحؑ۔ حضرت الیاس علیہم السلام۔ حضرت علیؓ۔
حضرت امام حسینؓ۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ۔ امام ابوحنیفہؒ اور 72 شہدائے کربلا کے علاوہ

شام: حضرت یحییٰؑ۔ حضرت زکریاؑ۔ حضرت ہابیل علیہم السلام۔ حضرت اُمِ حبیبہؓ۔ حضرت اُم کلثومؓ۔ حضرت سیدہ زینبؓ۔ حضرت خالد بن ولیدؓ۔
حضرت بلالؓ۔ سید صلاح الدین ایوبیؒ وغیرہ

حج پیکج

بشمول تمام اخراجات سوائے طعام

بذریعہ سڑک	کراچی سے بذریعہ جہاز	اسلام آباد/لاہور پشاور سے بذریعہ جہاز
75,000	82,000	85,000

بکنگ صرف 25000 روپے میں پہلے آیئے پہلے پایئے کی بنیاد پر
(نشستیں محدود ہیں)

عمرہ پیکج

بشمول تمام اخراجات سوائے طعام

ایک دن	سات دن	چودہ دن	بذریعہ شام بشمول زیارات
28,000	31,000	33,000	40,000

قربانی کی بکنگ جاری ہے

360/-
قیمت -/300 ریال فی عدد

الحبیب ٹورز اینڈ ٹریولز انٹرنیشنل

AL-HABIB
TOURS & TRAVELS INTERNATIONAL

12۔ العباس مارکیٹ آدم جی روڈ، راولپنڈی صدر۔ موبائل: 0300-9557977

32۔ ہل روڈ F-6/3 اسلام آباد فون: 227.5294, 287.3679 فیکس: 287.5889

SHAKIR.COM

رسائل ومسائل

خاتون ڈاکٹر کے لیے سرجری کی تعلیم

سوال: میں نے حال ہی میں میڈیکل گریجویشن کیا ہے۔ آج کل ہاؤس جاب کر رہی ہوں۔ الحمدللہ پردہ کرتی ہوں اور حتی الامکان یہاں کی لغویات سے بچنے کی کوشش ہوتی ہے۔ میں اسپشلائزیشن کے لیے جنرل سرجری لینا چاہتی ہوں۔ ایک تو میرا ذاتی رجحان اس طرف ہے دوسرے یہ کہ اس فیلڈ میں لیڈی ڈاکٹر کی اشد ضرورت کے باوجود شدید کمی ہے۔ خواتین کو مرد ڈاکٹروں سے جسم کے اعضا کا معائنہ کروانا پڑتا ہے۔ اگر خواتین سرجن ہوں تو یہ صورت پیش نہ آئے۔ لیکن سرجری لینے میں جو باتیں رکاوٹ بن رہی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں کہ مجھے جنرل سرجری پوری ہی لینی ہے۔ اس میں مردانہ زنانہ الگ الگ نہیں ہیں' یعنی پھر مجھے مردانہ جسم کے اعضا کا معائنہ بھی کرنا پڑے گا۔ اگر میں اس میں جاتی ہوں تو پھر رات دن مردوں کے ساتھ کام کرنا پڑے گا۔ پاکستان میں ایم بی بی ایس کرنے کے لیے' یعنی کسی قابل ہونے کے لیے تقریباً پانچ سال درکار ہیں اور پھر اپنے ایمان کی سلامتی کے لیے ان تھک محنت کے علاوہ گھر والوں اور معاشرے کا تعاون بھی چاہیے۔

اس صورت میں سوال یہ ہیں کہ: ۱- کیا مجھے خواتین کی خاطر سرجری لینا چاہیے یا یہ دوسروں کی دنیا بنانے کی خاطر اپنی آخرت برباد کرنے کے مترادف ہوگا؟ ۲- اللہ کے سامنے کیا اس کی پوچھ ہوگی کہ جتنا علم حاصل کیا اس پر کہاں تک عمل کیا؟ کیا صرف یہ دینی تعلیم کے لیے ہے یا میں ایم بی بی ایس کی ڈگری لے کر گھر بیٹھ جاؤں تو اس پر بھی لاگو ہوگا؟ سرجری لینے سے میری ذاتی زندگی بھی بہت متاثر ہوگی اور مشرقی لڑکی ہونے کے ناطے میں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ خود نہیں کرسکتی ہوں کہ شادی کے بعد کوئی مجھے کچھ کرنے بھی دے گا یا نہیں۔

جواب: آپ کے خط سے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے ساتھ ساتھ آپ کو

دین پر عمل کرنے اور دین ہی کی روشنی میں اپنے پروفیشن کا انتخاب کرنے کی فکر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری قوم میں آپ جیسی اور بہت سی بچیاں پیدا کرے جو ہر معاملے میں اللہ کی رضا کو بنیاد بنا کر ذمہ دارانہ فیصلہ کریں۔

اسلام میں طلب علم اور حصول علم پر جتنا زور دیا گیا ہے میرے خیال میں دنیا کے کسی اور مذہب نے ایسا نہیں کیا ہے۔ اس حصول علم میں جہاں قرآن و حدیث' سیرت پاکؐ اور فقہ کا علم شامل ہے وہیں دیگر علوم بھی شامل ہیں۔ علم میں اضافہ اور طلب علم کے بارے میں قرآن کا حکم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت تمام علوم کا احاطہ کرتی ہے۔ خصوصی طور پر وہ علوم جو انسانی جان وصحت کا تحفظ کرتے ہیں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ اگر علم طب یا جراحت میں تخصص اس غرض سے حاصل کیا جائے کہ ایک مسلم یا مسلمہ انسانوں کی خدمت کے ذریعے' اللہ کی رضا کا حصول کر سکے تو یہ بمنزلہ عبادت ہے۔ لیکن حصول علم ہو یا پیشہ ورانہ زندگی' اسلام کی بنیادی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے ہی اس کا حصول ہونا چاہیے۔ حیا دین کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے۔ حدیث شریف میں ارشاد ہوتا ہے کہ جسے حیا نہیں وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ حیا کو ایمان کی ایک اہم شاخ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن و حدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان' مرد ہو یا عورت' بے حیائی کا کام کبھی نہیں کر سکتا۔ ہاں' جب ایمان مُردہ ہو جائے' بے حسی طاری ہو جائے اور حیا کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے تو پھر ایسا شخص جو کچھ بھی کر گزرے وہ کم ہے۔

مرد و زن کو حیا کی زندگی گزارنے اور بے حیائی اور بے شرمی سے بچانے کے لیے اسلام نے اخلاقی تعلیمات کے ذریعے اس کے ضمیر اور قلب و ذہن کو ایسی تربیت دینی چاہی ہے کہ ہر بے شرمی اور بے حیائی کے کام سے وہ خود بخود رک جائے۔ چنانچہ قرآن کریم شوہر اور بیوی کے تعلقات پر بات کرتا ہے لیکن اس کا اسلوب اور انداز برہمن ازم کی مشہور کتاب جیسا نہیں ہے۔ وہ طہارت کے مسائل بیان کرتا ہے لیکن ایسے انداز میں کہ ایک فرد کو شرمندگی نہ ہو۔ اسی طرح بچے کی پیدایش کے حوالے سے وہ چاہتا ہے کہ ایک خاتون طبیبہ یا دائی اس کام کو کرے۔ گویا گائنی کے شعبے میں تخصص حاصل کرنے' یعنی اسپشلائزیشن کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور خود خواتین کے حوالے سے بھی یہ سمجھاتا ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو صرف جس حد تک ضرورت ہو جسم کے اتنے حصے کو کھولا جائے۔ یہ نہیں کہتا کہ ایک طبیبہ کو معائنہ تو کرنا ہے گلے کا اور ایک مریضہ اس کے سامنے پوری عریاں ہو جائے۔ چنانچہ اگر کسی جگہ صرف خواتین ہی ہوں اور سب اہل ایمان ہوں' اس شکل میں بھی وہ ایک دوسرے کے سامنے عریاں نہیں آ سکتیں۔

ان تمام واضح تعلیمات کے باوجود فرض کیجیے کہ ایک خاتون دریا میں پھسل کر گر گئی اور آس پاس صرف اجنبی مرد ہی تیراک ہیں جو اس کی جان بچا سکتے ہیں۔ ایسی شکل میں کیا اس بنا پر کہ شریعت غیر محرم کے جسم کو ہاتھ

لگانے کو حرام ٹھیراتی ہے اس خاتون کو ڈوبنے دیا جائے گا یا ایک اجنبی شخص پانی میں کود کر اسے اپنے ہاتھوں میں لے کر دریا سے نکالے گا؟ یا فرض کیجیے ایک خاتون کے کپڑوں میں آگ لگ جاتی ہے اور گھر کا کوئی فرد پاس نہ ہو تو کیا ایک اجنبی پڑوسی مرد کا فرض نہیں ہے کہ آگ بجھانے کے لیے اس پر کمبل ڈال کر شعلوں کو ہاتھ سے دبائے۔ چاہے اس عمل میں وہ اس عورت کے جسم کے بعض حصوں کو حادثاتی طور پر دیکھ بھی رہا ہو؟ گویا شریعت میں ان معاملات میں بھی جہاں واضح حرام طے کر دیا گیا ہے زیادہ اہم معاملات کی بنا پر اس لمحے کے لیے ایک اقدام نہ صرف جائز بلکہ لازمی ہو جاتا ہے۔

میڈیکل پریکٹس کے دوران اس طرح کے بہت سے واقعات پیش آسکتے ہیں جن میں ایک خاتون کو نہ صرف سینے کی حد تک بلکہ اس سے بھی زیادہ اپنا جسم کسی طبیب یا سرجن کے سامنے کھولنا پڑتا ہوگا اس وقت اس کی شرم کی کیفیت صرف وہ خود ہی سمجھ سکتی ہے۔ اگر یہ کام بار بار کیا جائے تو یا تو ہر مرتبہ اسی شدت سے شرمندہ ہوگی یا آہستہ آہستہ اس کی عادی ہو کر شرم میں کمی کی مرتکب ہوگی۔ دونوں شکلوں میں ایمان کا امتحان ہوگا۔ اس کے مقابلے میں اگر ایک خاتون سرجن کے سامنے یہ معاملہ ہو تو مقابلتاً کم شرمندہ ہوگی۔ فقہ کا اصول ہے کہ اگر دو برائیوں میں انتخاب کرنا ہو تو کم تر برائی کو اختیار کرنا چاہیے۔ اس لیے اُمت مسلمہ پر خواتین سرجن اور ایسی ماہرین کا پیدا کرنا جو خواتین کے مخصوص طبی مسائل پر گہری نگاہ رکھتی ہوں ایک فرض کفایہ ہے۔ اگر چند ایک خواتین یہ نہ کریں گی تو تمام اُمت پر گناہ ہوگا' اور اگر چند خواتین ہر معاشرے میں ان میدانوں میں تخصص اختیار کریں گی جن کا تعلق خواتین کے خصوصی مسائل سے ہو تو وہ خود اور دوسرے بھی گناہ سے بچ جائیں گے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ ایک خاتون سرجن بھی جسے دن میں ۱۰ مرتبہ خواتین کے مخصوص اعضا کا معائنہ کرنا پڑتا ہو' یہ کام کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کے احساس کے ساتھ بطور مجبوری اور بطور فرض اس کام کو کرے گی۔ وہ اپنی حیا اور دوسروں کی حیا کا پورا پاس کرتے ہوئے حتی الامکان نگاہوں اور دماغ کو ان مناظر کا عادی نہیں بنائے گی۔

دوسرا سوال جو آپ نے اٹھایا ہے وہ خالص ذاتی نوعیت کا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جہاں ایک طرف طبی ماہرین اور سرجنوں کی شدید ضرورت ہے وہاں عملاً صورت حال کچھ ایسی ہے کہ ایم بی بی ایس کے بعد جب ایک لڑکی پانچ سال لگا کر فیلوشپ مکمل کرتی ہے تو گھر والے یا شوہر یا خود اس کے اپنے حالات بچوں کی تربیت کے حوالے سے اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ تمام تربیت اور مہارت کو ایک جانب رکھ کر صرف ایک کامیاب بیوی اور ماں بن کر اپنے آپ کو مطمئن کر لے۔ میرے خیال میں اس مسئلے کا کوئی منطقی حل تجویز نہیں کیا جاسکتا۔ سب سے پہلے یہ بات آپ کو طے کرنی ہوگی کہ آپ کے گھر میں کیا روایت ہے اور جہاں آپ

کے والدین آپ کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں وہاں کیا روایت ہے؟ ظاہر ہے کہ ازدواجی زندگی تکمیل ایمان کا ذریعہ ہے اور اسے پروفیشن پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔

پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا آپ کے علاوہ دیگر طالبات اس تخصص کو اختیار کر رہی ہیں جس سے خواتین کو ڈاکٹر کے سامنے شرمندگی نہ ہو؟ اگر کچھ اور طالبات یہ کر رہی ہیں تو آپ پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی بھی اس جانب مائل نہ ہو تو کسی کو تو یہ کام کرنا ہوگا تاکہ مرد ڈاکٹروں کے سامنے خواتین کے حیا کے تقاضے مجروح نہ ہوں۔

اس تخصص کے حصول میں اگر آپ کو مردوں کے ساتھ کام کرنا پڑے' اور اس کا کوئی متبادل نہ ہو تو شریعت میں اس کے لیے ''ضرورہ'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی اور ذریعہ نہ ہو تو ایسا کرنا اس وقت تک جائز ہوگا جب تک متبادل ذریعہ پیدا نہ ہو جائے' یعنی ایسی ماہر فن خواتین ڈاکٹر آپ کو نہ مل جائیں جو اس فن کو آپ کو سکھا سکیں۔ اگر کوئی میڈیکل کالج ایسا ہو جہاں پر خواتین معلمات ہوں اور وہ اس میدان میں ماہر ہوں تو آپ پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہاں جا کر حصول علم کریں۔ لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اس علم کے لیے جب آپ کو یہ کام خواتین کی فلاح کی غرض سے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو بے حیائی سے بچانے کے لیے سیکھنا ہے، ''مجبور'' ہونے کے سبب اس پر کوئی گرفت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو آپ کی نیت کا علم سب سے زیادہ ہے' اور وہ حالت اضطرار میں کسی کام کے کرنے سے بھی پوری واقفیت رکھتا ہے۔ ہاں' اس کے باوجود استغفار کا کثرت سے کرنا اور ایسے مناظر کے بعد ذہن کو بار بار یاد دلانا کہ یہ سب کچھ صرف اللہ کی بندیوں کو شرمندگی سے بچانے کے لیے کیا جا رہا ہے' ان شاء اللہ اجر میں اضافے کا باعث ہوگا۔

طب اور فقہ دو ایسے علوم ہیں جن میں اپنی طبیعت اور ذاتی رجحان کے خلاف بعض معاملات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک ایک فقیہہ طہارت اور ناپاکی کے مسائل کو تفصیلات میں جا کر مطالعہ نہ کرلے' ان مسائل پر رائے نہیں دے سکتی۔ ایسے ہی طبیب کے لیے بہت سی ناخوش گوار باتوں کا مطالعہ کرنا' حتیٰ کہ ناخوش گوار مناظر کا دیکھنا ایک مجبوری ہے اور ایسے تمام مواقع پر بار بار اللہ تعالیٰ سے مدد اور مغفرت طلب کرتے رہنا ہی انسان کو صراط مستقیم اور عمل صالح پر قائم رکھ سکتا ہے۔

آپ نے اپنے خط میں جن جذبات کا اظہار کیا ہے مجھے یقین ہے ان شاء اللہ اگر آپ نے طے کیا کہ سرجری میں اسپیشلائز کرلیں یا آپ نے کسی اور شعبے میں جانے کا طے کیا' بہرصورت آپ ایک مثالی اور باکردار صاحب ایمان طبیبہ کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کریں گی اور دوسروں کے لیے ایک قابل تقلید مثال بھی پیش کرسکیں گی۔ شادی کے بعد آپ اور آپ کے شوہر باہمی مشورے سے طے کرسکتے ہیں کہ آپ کتنا وقت اپنے

شعبے کو دیں اور کتنا وقت گھر کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں صرف کریں۔ (ڈاکٹر انیس احمد)

توبہ سے متعلق چند غلط فہمیاں

س: عمداً ایک گناہ کو کرنا' اس میں لذت محسوس کرنا اور پھر یہ تصور رکھ کر کرنا کہ معافی مانگ لوں گی اور وہ ہزار بار گناہ کرنے پر بھی معاف کر دے گا' اس طرح انسان گناہ سے کب تک بچے گا؟ جب حقوق العباد بندے اور بندے کے درمیان ہی معاملہ ہے تو پھر اللہ سے معافی مانگ کر انسان کیسے بخشا جائے گا؟ کیا استغفار صرف حقوق اللہ کے ادا نہ کرنے پر ہے؟ اور اگر حقوق العباد غصب ہوئے ہوں تو پہلے بندوں سے معافی مانگنی ہوگی؟ کیا اللہ سے توبہ و استغفار کرنے سے بندوں کی حق تلفی معاف ہوسکتی ہے؟

میرا بھائی بدکاری کرتا ہے اور اپنے اسکینڈلز کو انجوائے کرتا ہے۔ آپ کے رسالے میں توبہ و استغفار اور معافی مانگنے اور گناہ گار انسانوں کی پذیرائی کے متعلق پڑھ کر وہ بہت خوش ہوا کہ اللہ تعالیٰ تو خود چاہتا ہے کہ انسان گناہ کریں' اسی لیے گناہوں میں کشش اُس نے خود رکھ دی ہے۔ خصوصاً اس بات سے وہ بہت مطمئن ہوا کہ اگر انسان گناہ نہ کرے تو اللہ کوئی اور مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور پھر معافی مانگ لیتی۔ کیا واقعی اللہ تعالیٰ انسانوں کا گناہ گار ہونا پسند ہے؟ کیا اس بات کا یقین رکھا جاسکتا ہے کہ ہر بار گناہ اور معافی' لازم و ملزوم ہیں' یعنی محض گناہ کی معافی مانگنے سے اللہ پر لازم آجاتا ہے کہ وہ بندے کو معاف کر دے؟

ج: قرب الٰہی کا صرف وہ طریقہ اسلامی ہوسکتا ہے جس کی سند قرآن کریم یا اسوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتی ہو۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا مقصد ہی یہ تھا کہ اللہ کے بندوں کو عملاً یہ بات کر کے دکھا دی جائے کہ کس طرح ایک بندہ اپنے آپ کو اپنے رب سے قریب کرسکتا ہے۔ قرآن کریم سے ہمیں جو ہدایات ملتی ہیں ان میں چند یہ ہیں: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو رات کی تنہائی میں تہجد کی شکل میں یاد کرنا' فجر میں تلاوت قرآن کرنا' اللہ کو اپنی شہ رگ سے قریب محسوس کرنا' اُٹھتے بیٹھتے حتیٰ کہ لیٹے ہوئے بھی اس کے بہترین اور خوب صورت صفاتی ناموں سے یاد کرنا' ہر کام کا آغاز اس کے نام سے کرنا' ہر کام کی تکمیل پر اس کا شکر ادا کرنا' اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ہر عمل کی تقلید و پیروی کرنا۔ گویا قرب الٰہی کے ذرائع نہ مبہم ہیں' نہ ہر فرد کی اپنی رائے اور سوچ پر منحصر ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہو لیکن کسی لمحے بھول کر غلطی کر بیٹھے تو کیا وہ

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تباہ ہوگیا یا اس کے دوبارہ اللہ تعالیٰ سے قریب آنے کا امکان ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن و حدیث یہ دیتے ہیں کہ بھول کر ایک غلطی کرنے کے فوراً بعد شرمندگی اور غلطی کے احساس کے ساتھ وہ اپنے رب سے معافی طلب کرے اور ساتھ ہی یہ عہد بھی کرے کہ اب یہ غلطی دوبارہ کبھی نہیں ہوگی، جب قرب الٰہی کا راستہ نکلتا ہے۔ اگر ایک شخص عملاً غلطیاں کرتا چلا جائے اور ساتھ ہی یہ بھی سوچتا رہے کہ چونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ رحمٰن و رحیم و غفور ہے اس لیے معاف کر ہی دے گا تو یہ خود اپنے اُوپر ایک غلطی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک مذاق ہے۔

استغفار اور توبہ کے لیے قرآن کریم نے جو اصطلاح استعمال کی ہے وہ تَوْبَةً نَّصُوْحًا (التحریم ۶۶:۸) کی ہے جس کے واضح معنی یہ ہیں کہ ایسی توبہ جس کے بعد گناہ کا ارتکاب پھر کبھی نہ کیا جائے۔ اگر محض عقل عامہ (common sense) کا استعمال کرلیا جائے تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ ایک طالب علم اسکول روزانہ لیٹ آتا ہو اور ہر دن استاد سے یہ کہے کہ آج غلطی ہوگئی، آیندہ وقت پر آؤں گا تو کیا استاد کو اس کی غلطی کو مسلسل معاف کرتے رہنا چاہیے یا طالب علم کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے اس پر سختی کر کے جرمانہ و سزا اور آخر کار اسکول سے خارج کرنے کی کارروائی کے ذریعے نہ صرف اسے بلکہ دوسروں کو بھی وقت کی پابندی کی اہمیت کا احساس دلانا چاہیے۔

کیا ایک شخص سچ بول کر اپنی غلطی کے اعتراف کی بنا پر جو عزت کسی کی نگاہ میں حاصل کرتا ہے وہ روزانہ باقاعدگی سے غلطی کر کے اور اس کا اظہار کر کے معمولی سی عزت بھی حاصل کرسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ لازماً گناہ گار کی توبہ سے خوش ہوتا ہے کہ جو راستہ بھٹک گیا تھا وہ کجی اور بے راہ روی سے باز آ گیا اور اب غلط راستے پر نہیں جائے گا۔ اس طرح ایک گناہ گار توبہ کے بعد ایک نیک شخص بن گیا لیکن بطور عادت اور عملاً گناہ کرتے جانا نہ عقل کے مطابق ہے اور نہ یہ بات اللہ تعالیٰ کو ہی خوش کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کسی کا گناہ گار ہونا قطعاً پسند نہیں۔ ہاں، گناہ گار کا نیکی کی طرف بڑھنا اور گناہ سے مستقل طور پر تائب ہونا لازماً پسند ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ کے بھائی نے کس بات پر یہ نتیجہ نکال لیا کہ جان کر اور بالارادہ ایک گناہ کیا جائے پھر صرف زبان سے توبہ کرلی جائے تو اللہ تعالیٰ خوش ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم اچھی طرح ہے کہ یہ توبہ زبانی ہے یا اس کے ساتھ آیندہ غلطی نہ کرنے کا مصمم ارادہ اور پختہ عزم بھی شامل ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ اس کی طرف آنے کے بعد بندہ دوبارہ شیطان کی پارٹی میں شامل نہ ہو۔ یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ ہر توبہ کے بعد اللہ تعالیٰ پر اس کا مان لینا لازم ہوجاتا ہے، گو صدق دل سے اور پختہ عہد کے ساتھ کی جانے والی توبہ کے بارے میں قوی امکان یہی ہے کہ اسے قبول کرلیا جائے۔

سوال کے دوسرے حصے کا تعلق ان جرائم کے بارے میں ہے جن میں محض ایک فرد خود نہیں بلکہ دوسرا بھی ملوث ہوتا ہے' مثلاً زنا۔ قرآن کریم نے اس جرم کے لیے خود حد کا تعین کر دیا ہے اور اسلامی ریاست، پر یہ پابندی لگا دی ہے کہ وہ اس حد کا اجرا کرے گی۔ یہ کام کوئی فرد اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا لیکن جرم کی سزا سے قبل جس شخص نے اس اخلاقی غلطی کا ارتکاب کیا ہو اسے یہ موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی بے گناہی ثابت کر سکے اور جس نے اس پر الزام لگایا ہے وہ شواہد پیش کر سکے۔

اگر اس اخلاقی جرم کا علم صرف اس کے کرنے والے کو ہے اور وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے توبۃ نصوحًا کرے' یعنی توبہ کے بعد کبھی جرم کی طرف رخ بھی نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت و مغفرت کی بنا پر امید کی جاسکتی ہے کہ وہ معاف فرما دے گا۔ لیکن اس نیت سے معافی مانگنا کہ بار بار غلطی کرتے جانا ہے اور معافی مانگتے جانا ہے' یہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کو بلکہ خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دینا ہے جس کی کوئی گنجایش اسلام میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو انسانوں کے گناہ سے بچنے اور نیکی کی طرف بڑھنے سے خوشی ہوتی ہے۔ کسی کا گناہ گار ہونا اسے غضب ناک تو کر سکتا ہے خوش نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اسلام نہیں لاتا جس کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو دعوت دینے والے نے صحیح طور پر دعوت نہیں دی یا ابھی اس میں سچائی اور حق کو قبول کرنے کی خواہش بیدار نہیں ہوئی۔ ایسی حالت میں اللہ ہی اسے ہدایت دے سکتا ہے' تنہا انسانی کوشش اور جدوجہد ہی اسے مسلمان کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ (ا - ا)

دفتر سے خط و کتابت میں' خصوصاً شکایت میں' **خریداری نمبر** کا حوالہ ضرور دیجیے:

مینیجر ترجمان القرآن' 5-اے' ذیلدار پارک' اچھرہ' لاہور-فون: 7587916 فیکس: 7585590

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ○ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک بری موت سے بچاتا ہے ○ چھپا کر دیا جانے والا صدقہ رب کی آتش غضب بجھاتا ہے ○ اور صلہ رحمی سے عمر میں برکت ہوتی ہے۔ (ترغیب بحوالہ طبرانی)

کتاب نما

اہانت رسولؐ اور آزادیِ اظہار مع بہائی کمیونٹی' ابوالامتیاز ع س مسلم۔ ناشر: مجلس نشریات اسلام '۱ کے'
۳ ناظم آباد مینشن' ناظم آباد' کراچی-۷۴۶۰۰۔ صفحات: ۱۷۴۔ قیمت: درج نہیں۔

تکریم رسولؐ کیا ہے؟ اور مقامِ رسالتؐ کے تقاضے کیا ہیں؟ اِس حوالے سے گذشتہ چند برسوں میں پاکستان کے مسلم معاشرے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے اور پروپیگنڈے کے ذریعے فضا کو مسموم کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ این جی اوز' حقوق انسانی کے نام نہاد علم بردار' مغرب زدہ سیکولر دانش ور اور بھارت نواز عناصر مسلمانوں کی حمیتِ ایمانی میں نقب زنی کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔

ابوالامتیاز مسلم صاحب کی معروف حیثیت شاعر کی ہے لیکن حیرت انگیز طور پر انھوں نے ایک نازک علمی اور دینی مسئلے کے بارے میں ایک خوب صورت کتاب تحریر اور شائع کی ہے۔ قانون اہانتِ رسولؐ کے خلاف انھیں کسی ایم ایچ کے کا خط فیکس کے ذریعے موصول ہوا جو اس کتاب کا محرک بنا۔ انھوں نے معترض کے خطوط اور اپنے جوابی خطوط ایک دل چسپ مباحثے کے انداز میں جوں کے توں نقل کیے ہیں۔

مصنف کہتے ہیں کہ چونکہ پاکستان کا اسلامی تشخص بعض طاقتوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے' اس لیے وہ ہمیشہ تاک میں رہتی ہیں کہ بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا الزام لگا کر اور کبھی بنیاد پرستی اور دہشت گردی کی تہمت عائد کر کے ہمیں بدنام کریں' پابندیاں عائد کریں اور ہر وقت ہم کو شکنجے میں رکھیں۔ یہ بدیہی امر ہے کہ وہ اس قسم کی تحریکوں کو اُکساتی' فروختنی' سماجی کارکنوں' دانش وروں اور قلم کاروں کو استعمال کرتی' انھیں فکری اور مالی امداد فراہم کرتی اور پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لیے ان کی مذموم کوششوں کی حوصلہ افزائی اور اشاعت کرتی ہیں تاکہ اپنے قبیح مقاصد کی تکمیل کے لیے بہانے ڈھونڈ سکیں (ص ۳۳)۔ ضمناً بہت سے متعلقہ موضوعات زیر بحث آئے ہیں' جیسے: بشپ جان کی خودکشی' ایک لڑکے کی قانون اہانتِ رسولؐ کے تحت سزایابی' غازی علم الدین شہید' غازی عبدالقیوم' علی محمد باب' بہائیت' مساوات مرد و زن وغیرہ وغیرہ۔

کتاب کا تعارف مولانا وصی مظہر ندوی اور مقدمہ مولانا عبداللہ عباس ندوی نے لکھا ہے۔ مولانا وصی مظہر کے بقول: ابوالامتیاز کی تحریر "جذباتیت کی بجائے علم و استدلال پر مبنی ہے" اور انھوں نے قانون

اہانت رسولؐ کی ضرورت' اہمیت اور افادیت کو تاریخی پس منظر کی روشنی میں نہایت موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ طباعت و اشاعت معیاری ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

کلام رحمٰن: بائبل یا قرآن؟ راجا محمد شریف قاضی۔ ناشر: فیروز سنز' ۶۰ شاہراہ قائداعظم' لاہور' صفحات: ۳۴۱۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔

۱۶ ابواب پر مشتمل زیرنظر کتاب میں تاریخی' علمی اور منطقی دلائل و براہین سے قرآن کریم کی حقانیت اور صرف اسی کتاب کا کلام الٰہی ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی تنزیل سے قبل' انبیاے کرامؑ پر کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے' مگر اب قرآن کریم کے سوا کوئی بھی الہامی کتاب اور صحیفہ موجود نہیں۔ اور اگر کچھ ہے بھی تو وہ خدا کا کلام نہیں' کیونکہ اس میں اس قدر تحریف ہو چکی ہے کہ اب اس تحریف شدہ پیغام سے الہامی ضابطوں کو علیحدہ کرنا ممکن نہیں رہا۔ اصل متن کی ترویج و اشاعت کے بجاے رنگارنگ ترجموں کی اشاعت و طباعت نے بھی الہامی آثار کو بے پناہ نقصان پہنچایا اور یوں الہامی پیغام اپنے مجموعی لفظی و معنوی تناظر میں محفوظ نہ رہ سکا۔ زیرنظر کتاب کے مصنف نے نہایت دقت نظر اور محنت سے یہ ثابت کیا ہے کہ بقول محمد عجائب اعوان: ''مروجہ انجیل ایک تحریف شدہ انجیل ہے اور موجودہ عیسائیت کا بانی سینٹ پال تھا' جو ابتدا میں حضرت عیسٰیؑ علیہ السلام اور عیسائیت کا سب سے بڑا مخالف اور دشمن تھا۔ مقام حیرت ہے کہ موجودہ عیسائیت کے عقائد اور نظریات زیادہ تر اسی شخص کے خطوط پر مبنی ہیں' جنھیں وہ الہامی گردانتا تھا اور پھر انھی کو عیسائیوں میں قبول عام کا شرف حاصل ہوگیا'' (ص ۱۵)۔

راجا محمد شریف قاضی نے اس کتاب میں بائبل کے تضادات کو قرآن کریم کی روشنی میں نمایاں کیا ہے۔ ان کا انداز بیان سراسر علمی اور تاریخی ہے۔ متلاشیانِ حق کے لیے اس کتاب میں بہت کچھ ہے' مگر وہ لوگ جو تعصب کی عینک لگا کر اس کا مطالعہ کریں گے شاید جادۂ ہدایت پر گامزن نہ ہوسکیں۔ عہدِ جدید کا انسان فکری تشکیک کا شکار ہے' اس کے لیے یہ کتاب آبِ حیات کا حکم رکھتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کتاب کے ترجمے دنیا کی تمام بڑی زبانوں بالخصوص مغربی زبانوں میں کیے جائیں تاکہ اس کی خواندگی کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہوسکے۔ مصنف کا اسلوب تحریر سادہ اور سائنٹفک ہے۔ اس میں کہیں بھی جھول یا الجھاؤ نہیں۔ ہر وہ بات جو وہ کہنا چاہتے ہیں' صاف اور واضح انداز میں کہہ دی گئی ہے۔ ابلاغ اور ترسیل کی یہ قدرت اور قوت ہر کسی کا مقدر نہیں ہوتی۔ مصنف کتاب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ خداوند کریم نے انھیں قدرت کلام اور قوت استدلال کی دولت سے نوازا ہے۔ (عبدالعزیز ساحر)

رشک زمانہ لوگ' صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی۔ ناشر: خورشید گیلانی ٹرسٹ ۲۲' ایچ مرغزار آفیسرز کالونی' ملتان روڈ' لاہور۔ صفحات: ۱۹۲۔ قیمت: ۱۱۰ روپے۔

سید خورشید احمد گیلانی مرحوم پر ''خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود'' کی مثل صادق آتی ہے۔ وہ ایک خوش نوا خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت منجھے ہوئے' پختہ کار ادیب بھی تھے۔ مدتوں کوچۂ صحافت میں قلم کی جولانیاں دکھائیں۔ ان کی متعدد تصانیف چھپ چکی ہیں۔ یہ کتاب ۳۵ مرحوم اور زندہ شخصیات پر اُن کے کالموں اور مضامین کا مجموعہ ہے جسے حال ہی میں ان کے برادر گرامی سید ارشاد احمد عارف نے یکجا کر کے شائع کیا ہے۔ انھیں آپ شخصیے یا خاکے بھی کہہ سکتے ہیں۔

زیادہ تر خاکے تاثراتی اور تحسینی و توصیفی ہیں۔ البتہ چند ایک میں تجزیاتی انداز بھی ملتا ہے (محمد طفیل' احسان دانش وغیرہ)۔ خورشید گیلانی نے یہ تذکرے ایک گہری اور پرخلوص محبت یا عقیدت کے ساتھ لکھے ہیں۔ بزرگوں کے تذکروں میں تو کسر وانکسار بجا اور مدح وعقیدت فطری ہے اور مناسب بھی لیکن یہ خورشید گیلانی کی ذہنی وسعت اور فراخی قلب ہے کہ انھوں نے بہت سے معاصرین اور ایک اعتبار سے بعض خردوں کا ذکر بھی بڑی اپنائیت سے کیا ہے۔ مولانا مودودی' امام خمینی' علی شریعتی' علی میاں' سعید احمد کاظمی' عبدالستار خان نیازی' پیر کرم شاہ الازہری' مفتی محمد حسین نعیمی اور متین ہاشمی کی صف میں کوثر نیازی کا تذکرہ' قاری کے مطالعے کے لیے ایک طرح کا ''سپیڈ بریکر'' ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس خاکے کا ابتدائی حصہ موضوع کا ''جواز'' پیدا کرنے کی ایک واضح کاوش نظر آتی ہے۔ علماے دین کے علاوہ چند خاکے دانش وروں' ادیبوں' شاعروں اور نعت گو اصحاب پر بھی لکھے گئے ہیں (مرزا محمد منور' احسان دانش' وزیر آغا' م ش' محمد طفیل' حفیظ تائب' محمد صلاح الدین' انور سدید' حافظ لدھیانوی' طالب ہاشمی' انعام الحق کوثر' طاہر القادری' عبدالستار ایدھی وغیرہ)۔ ہر مکتب فکر اور طبقۂ خیال کے لوگوں پر قلم اٹھانا مرحوم کی بے تعصبی اور توازنِ ذہنی کی دلیل ہے۔ ان کے ادبی اور خطیبانہ اسلوب سے قاری کا ذہن ابوالکلام آزاد' ظفر علی خاں' بہادر یار جنگ' عطاء اللہ شاہ بخاری اور شورش کاشمیری کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

ترتیب و تدوین کے حوالے سے یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اول: ابتدا میں خورشید گیلانی کے مختصر کوائف حیات' دوم: مرحوم شخصیات کے سنین وفات' سوم: مضامین اور خاکوں کی تاریخ تحریر اور حوالۂ اشاعت بھی دے دیا جاتا تو کتاب زیادہ وقیع ہوتی۔ (ر - ہ)

نداے خلافت (فلسطین نمبر)' مدیر: حافظ عاکف سعید۔ پتا: ۳۶ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور۔ صفحات: ۹۲۔ قیمت:

۳۵ روپے۔

مسئلہ فلسطین، آج کا ایک سلگتا ہوا موضوع ہے۔ اسرائیل، امریکہ اور دنیا بھر کے مسلم دشمن عناصر کی تائید و اشیرباد، بلکہ بالواسطہ اور بلاواسطہ امداد و تعاون سے فلسطینی مسلمانوں پر، اگر کہا جائے کہ مظالم کے پہاڑ توڑ رہا ہے تو شاید ان الفاظ سے بھی حقیقت حال کی پوری ترجمانی نہیں ہوتی۔ مسلم حکمران اور حکومتیں خواب خرگوش میں مست و مدہوش بلکہ اُن میں سے بعض (نادانستہ ہی سہی) بالواسطہ ظالموں کے موید بنی ہوئی ہیں۔ ع:
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے۔

ندائے خلافت نے فلسطین، اسرائیل کے قیام، یہودیوں کی منصوبہ بندی، عیسائیوں اور ہنود کی تائید صہیونیت، عرب اسرائیل جنگوں کی پوری تاریخ (مع نقشہ جات اور تصاویر) مرتب کی ہے۔ آخر میں فرہنگ اصطلاحات بھی دیا ہے۔ اس موضوع پر یہ ایک عمدہ، معلوماتی اور جامع چیز ہے جسے اہتمام اور تحقیق سے تیار و مرتب کر کے سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ (ر-ہ)

ماہر القادری، حیات اور ادبی خدمات، ڈاکٹر عبدالغنی فاروق۔ ناشر: ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور۔ صفحات: ۵۰۷۔ قیمت: ۲۲۵ روپے۔

ماہرالقادری (م: ۱۲ مئی ۱۹۷۸ء) بیسویں صدی میں اردو ادب کے نامور ادیب اور دین اسلام کے سرگرم خادم تھے۔ انھوں نے ادب کی بیشتر اصناف (تنقید، افسانہ، ناول، شاعری، سفرنامہ، خاکہ، غزل، نظم) میں بلند پایہ ادب پارے تخلیق کیے۔ اُن کی ادبی زندگی میں جوہری طور پر ارتقائی مرحلہ بہت جلد طے ہو گیا اور وہ روایتی نوعیت کی ادبی رطب و یابس سے نکل کر مقصدیت کی شاہراہ پر چل پڑے۔ اس طرح انھوں نے زندگی کا بڑا حصہ: ادب برائے مقصد اور ادب برائے تعمیر، بلکہ ادب برائے بندگیِ رب سے ناتا جوڑنے کی بھرپور کوشش میں صرف کیا۔

زیرتبصرہ کتاب بنیادی طور پر (پنجاب یونی ورسٹی سے) ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے، جس میں ماہرالقادری کے مراحل حیات اور ان کے ادبی کارناموں کا تعارف و تجزیہ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ماہر کی نعت، غزل، نظم، ناول، افسانے، خاکے، سفرنامے، بعدازاں ان کی دیگر حیثیتوں (لغت نگار اور تنقید نگار، تبصرہ نویس، مدیر--- پھر ان کی مذہبی تحریریں، ترقی پسندوں پر ان کی تنقید اور ان کا اسلوب بیان) پر باب وار بحث کی گئی ہے۔

کسی ادیب اور تخلیق کار کی تحریروں کے حقیقی محاسن و معائب کا ادبی حوالے سے تنقیدی جائزہ و تجزیہ پیش کرنا جاں کاہی کا کام ہے، کیونکہ اس کے لیے زیر بحث فرد کی تخلیقات میں ڈوب کر گوہر شناسی کرنا پڑتی ہے

جس سے ادیب کے مقام و مرتبے کا تعین مطلوب ہوتا ہے۔

ماہرالقادری مرحوم نے اپنے ادارتی مقالات میں جن موضوعات پر جم کر لکھا' ان میں ایک مرکزی موضوع: جماعت اسلامی اور مولانا مودودیؒ ہے۔ اس کا بھرپور تجزیہ ضروری تھا۔ اس مقالے میں یہ کمی محسوس ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ زیرنظر مقالے میں اشعار اور نثری اقتباسات کم ہوتے اور نقد و تجزیہ زیادہ ہوتا' تو بہتر تھا۔

ماہرالقادری کو اردو ادب کی تاریخ میں بوجوہ نظرانداز کیا گیا' اس اعتبار سے مصنف کی یہ کاوش مستحسن ہے۔ انھوں نے ایک گونہ محبت و عقیدت مندی کے ساتھ لوازمہ جمع کیا ہے۔ ماہرالقادری مرحوم کے فکروفن اور ادبی و فکری کارناموں کے تعارف کے سلسلے میں یہ نقش اوّل ہے۔ امید ہے آیندہ چل کر مرحوم پر مزید تحقیقی کام ہوگا۔ (سلیم منصور خالد)

مقدماتِ علوم درسیہ' مولانا حافظ محمد صدیق ارکانی۔ ناشر: مولانا قاری عبدالحلیم' قدیمی کتب خانہ' آرام باغ' کراچی۔ صفحات: ۳۷۵۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

مصنف نے اپنے دورِ طالب علمی میں چند علوم وفنون سے متعلق مباحث کو قلم بند کیا تھا' اب افادۂ عام کے لیے انھیں شائع کیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں مختلف علوم اور موضوعات پر سات مقدمات لکھے ہیں: فقہ کی تعریف' اس کا تاریخی پس منظر اور ائمۂ اربعہ کے مختصر اصول' نحو' تاریخ اور اس کی چند اصطلاحات' صَرف اور اشتقاق' علم منطق' ہدایہ (ہدایہ اور صاحب ہدایہ کے بارے میں اہم علمی نکات)۔ کتاب کے آخر میں مفتاح کنوز العربیہ کے نام سے ایک اہم اور مفید رسالہ منسلک ہے جس میں علوم عربیہ اسلامیہ کی اہم اصطلاحات اور دیگر قیمتی معلومات کو یکجا کیا گیا ہے۔

جس آسان اور سلیس انداز میں علوم وفنون کے بارے میں بعض اہم اور گراں قدر معلومات دی گئی ہیں' وہ قابل تحسین ہیں' اس کتاب کی نوعیت علوم دینیہ کے طالب علموں کے لیے جنرل نالج کی کتاب کی ہے۔ (عبدالودود)

الصدیقؓ' پروفیسر علی محسن صدیقی۔ ناشر: قرطاس' پوسٹ بکس نمبر ۸۴۵۳' کراچی یونی ورسٹی' کراچی۔ ۷۵۲۷۰۔ صفحات: ۴۰۰۔ قیمت' مجلد: ۳۵۰ روپے' غیر مجلد: ۳۰۰ روپے۔

پروفیسر علی محسن صدیقی (پ: ۱۹۲۹ء) معروف مورخ ہیں اور کراچی یونی ورسٹی کے شعبہ اسلامی تاریخ سے وابستہ رہے ہیں۔ آپ نے ۱۱ کتابوں کے علاوہ ۱۰۰ کے قریب تحقیقی مقالات بھی تحریر کیے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب اسلامی تاریخ کے نہایت اہم اور پیچیدہ بحرانی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ گو یہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی "مکمل و مستند سیرت" (سرورق) ہے لیکن یہ داستان اس عظیم بحران کی تاریخ بھی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کے آخری لمحات میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ فتنۂ ارتداد اور انکارِ زکوٰۃ کی وجہ سے اسلام سمٹ کر دو تین شہروں تک محدود ہو گیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس بحران پر دور اندیشی کے ساتھ قابو پایا اور اسلام کی حکومت دوبارہ جزیرہ عرب پر قائم کر دی جس کے بعد اسلام کا فطری بہاؤ کفر کی سلطنتوں کو بہا لے گیا۔ ان کی حکومت کا یہ مختصر زمانہ ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ واقعی افضل الناس بعدالانبیا اور خلیفۃ الرسول بلافصل کہلانے کے حق دار تھے۔ ان کی فراست ایمانی اور قیادت بر ہانی نے اسلام کو دوبارہ متمکن کر دیا۔ دنیا جب تک رہے گی حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ احسان ہر اس شخص کی گردن پر رہے گا جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتا ہے۔

پروفیسر صدیقی نے یہ کتاب جدید انداز میں لکھی ہے جو ۱۳ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول' حالات قبل از خلافت' دوم: بیعت خلافت' سوم: جیش اسامہ' چہارم: فتنۂ ارتداد' پنجم: فتوحات' ششم: دینی خدمات' ہفتم: انتظام حکومت' ہشتم: خالصۂ رسول کی بحث' نہم: علمی مفاخر' دہم: فضلیت سیدنا ابوبکر صدیقؓ، یازدہم: سیرت صدیقؓ، دوازدہم: صدیقیت' سیزدہم: علالت و وفات۔

پروفیسر صاحب نے سیرت صدیقؓ سے متعلقہ تمام مسائل پر بحث کی ہے اور اپنا تجزیہ اور قول فیصل بیان کیا ہے۔ مستشرقین کے اعتراضات کا بھی جواب دیا ہے۔ (ملک نواز احمد اعوان)

تعارف کتب

☆ **قرآن اور صاحب قرآن کا اسلوب تعلیم**' پروفیسر رب نواز۔ ناشر: ادارہ تعلیمی تحقیق' ۳ بہاول شیر روڈ' مزنگ لاہور۔ صفحات: ۱۳۵۔ قیمت: ۷۵ روپے۔ [تعلیم و تربیت کے ضمن میں قرآن کی رہنمائی' نبی کریمؐ کا طریق تعلیم اور آپؐ کی تدریسی حکمت عملی پر سادہ و عام فہم انداز میں حوالوں کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے--- معلمین کے لیے مفید رہنما کتاب۔ "ادارہ تعلیمی تحقیق" کی کتابوں میں آیاتِ قرآنی پر اعراب کیوں نہیں؟ کیا اعراب کے بغیر قرآن صحیح پڑھا جا سکتا ہے؟]

☆ **خوفناک جدید صلیبی جنگ**' گریس ہیل سیل۔ ناشر: انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ' اے ۴۷' بلاک ۱۱' گلشن اقبال' کراچی۔ صفحات: ۱۴۴۔ قیمت: ۶۵ روپے۔ [مصنفہ نے صدر جانسن کے زمانے میں تین سال تک وائٹ ہاؤس میں سٹاف رائٹر (صدارتی تقریر نویس) کے طور پر کام کیا۔ صحافت سے وابستہ رہیں۔ دنیا بھر کی سیاحت کی۔ یہ ان کی کتاب Forcing God's Hand کا اردو ترجمہ ہے۔ ان کے خیال میں شدید متعصب اور بنیاد پرست عیسائی عالمی امن کے لیے خطرہ بن گئے ہیں۔ وہ مسجد اقصیٰ کو بھی مسمار کرنا چاہتے ہیں۔ اسٹیج کا مرکز اسرائیل ہے۔ کتاب کے ناشر زکی الدین شرفی

کا خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عالم اسلام کے خلاف امریکہ و برطانیہ کی حالیہ مہم' ایک خوف ناک ترین جدید صلیبی وصیہونی جنگ عظیم ہے۔]

☆ سیارہ' اشاعت خاص (مارچ' اپریل ۲۰۰۲ء)' نگران: نعیم صدیقی۔ مقام اشاعت: ایوانِ ادب' چوک اُردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۱۶۰۔ قیمت: ۵۶ روپے۔ [''تعمیری اور فلاحی ادب کا نقیب'' یہ رسالہ اپنی نوعیت کا واحد ادبی پرچہ ہے۔ معروف اور کہنہ مشق قلم کاروں کے ساتھ' چند نئے لکھنے والوں کی کاوشیں بھی شامل ہیں۔ مرزا محمد منور پر تحسین فراقی اور طاہر شادانی پر انور سدید کے خیالات۔ امین راحت چغتائی کا مضمون ''ادیب اور یک جہتی''۔ حمد ونعت' افسانے' غزلیں' تبصرے' سب قابل مطالعہ۔]

☆ **دفاع ختم نبوتؐ**' محمد طاہر رزاق۔ ناشر: عالمی مجلس تحفظ ختم نبوتؐ، حضوری باغ روڈ' ملتان۔ صفحات: ۱۹۶۔ قیمت: ۹۰ روپے۔ [ردِ قادیانیت کے سلسلے میں علما' صحافیوں اور اکابر کی مختلف النوع کاوشوں کا ذکر۔ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کی کچھ تفصیل۔ مسلم قادیانی مناظرے وغیرہ وغیرہ۔ ''ان چراغوں کو روشن کریں ان میں خونِ جگر ڈالیں...... قادیانیت کا اندھا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے''۔]

☆ **امریکی یلغار**' رفعت سروش فیصل۔ ناشر: ہم خیال پبلشرز' رحیم سنٹر پریس مارکیٹ' امین پور بازار' فیصل آباد۔ صفحات: ۲۰۳۔ قیمت: ۱۶۰ روپے۔ [ضمنی عنوان: ''سیاسی تجزیے''---افغانستان اور عالم اسلام پر حالیہ امریکی یلغار کے حوالے سے اور ملی نقطۂ نظر سے لکھے جانے والے کالم' رواں دواں اسلوب۔ کالموں کے ساتھ تاریخ تحریر لکھنا مناسب تھا۔]

☆ **حیا بھری نظر**' سجاد حمید خاں۔ ناشر: سجاد پبلشرز حمید مارکیٹ' کبیر سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔ صفحات: ۱۱۲۔ قیمت: ۳۶ روپے۔ [عفت قلب ونگاہ' اسلامی اصول معاشرت اور تزکیہ نفس کا اہم نکتہ ہے۔ ''قرآن وحدیث اور عقل کی روشنی میں'' حیا کی اہمیت اور نظر بازی کے فتنے یا بدنگاہی کی خرابیوں اور اس کے دور رس نقصانات کا بیان۔]

☆ **بلبلیں نواب کی**' موسیٰ رضا۔ ترجمہ: شاہ محی الدین فاروقی۔ ناشر: فضلی سنز' اُردو بازار' کراچی۔ صفحات: ۲۰۴۔ قیمت: ۱۲۰ روپے۔ [۱۹۶۰ء میں بھارتی انتظامی سروس (IAS) میں شامل ہو کر بیوروکریسی کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے والے ایک مسلمان افسر کے تجربات ومشاہدات پر مبنی ۱۵ ناولوں سے بھی دل چسپ ۱۵ واقعاتی مضامین۔ تاریخ' تہذیب' مزاج' ذہنیت' معاشرت اور تمدن کے مختلف پہلوؤں کی گرہیں کھولنے والی تحریریں۔]

☆ ۱- **کنز الحدیث**' ۲- **دنیا' قرآن وسنت کی روشنی میں** (احادیث کے دو مجموعے)' ترتیب وتدوین: محمد عمر خاں۔ ملنے کا پتا: قصر عبداللہ' کہکشاں سٹریٹ نمبر ۵' نیو گل گشت کالونی' ملتان۔ صفحات: ۹۰ اور ۷۲۔ قیمت: ۳۵ اور ۲۵ روپے۔ [آرٹ پیپر پر' خوب صورت ڈیزائن میں' پاکٹ سائز کے مجموعے۔ پہلا مجموعہ حقوق' عبادات اور اخلاقی کمزوریوں پر ہے۔ بہت اچھا انتخاب اور اچھی پیش کش۔ بڑی تعداد پر خصوصی رعایت۔]

اس رسالے میں اشتہار دینے والے اداروں یا افراد سے معاملات کی کوئی ذمہ داری ماہنامہ ترجمان القرآن کی انتظامیہ کی نہیں ہے۔ (ادارہ)

مدیر کے نام

محمد غوث رانا ' گجرات

''اشارات'' (جولائی ۲۰۰۲ء) میں یہ خوش خبری دی گئی ہے کہ پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے چھ دینی جماعتوں پر مشتمل متحدہ مجلس عمل کا اتحاد وجود میں آ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو قائم و دائم رکھے۔ میری تجویز ہے کہ متحدہ مجلس عمل کے تحت ایک شعبہ ''تعمیر اساس دین'' قائم کیا جائے جو اسلام کے بنیادی تصورات سے متعلق متفقہ لٹریچر عام فہم زبان میں تیار کرے اور بطور مرتبین تینوں مسالک (بریلوی' دیوبندی' اہلحدیث) کے مسلمہ علما کے دستخط اس پر موجود ہوں اور شیعہ علما کا تعاون بھی حاصل کیا جائے۔ اس لٹریچر سے عوام پر بڑے اچھے اثرات پڑیں گے' الجھنیں دُور ہوں گی' فرقہ وارانہ تعصب اور نفرت دُور ہوگی' اتحاد و اتفاق پیدا ہوگا اور نصب العین بھی واضح طور پر سامنے آئے گا۔ پہلے سے موجود لٹریچر سے استفادے کے ذریعے اس کام کو ترجیحی بنیادوں پر کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر طاہر احمد چودھری ' لودھراں

مسالک کے حوالے سے ہمارے ہاں جس شدت پسندی کا رجحان موجود ہے اس میں ایک پڑھے لکھے شخص کے لیے بھی بسا اوقات صحیح رویے کا تعین مشکل ہو جاتا ہے لیکن مولانا عبدالمالک کا مضمون: ''مختلف مسالک پر عمل'' (جون ۲۰۰۲ء) بہت سے اشکالات کو حل کر دیتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ حقیقت کا متلاشی اس مضمون کو پڑھنے کے بعد درست نتیجے تک نہ پہنچ سکے۔ ہاں' اگر دماغ میں بت خانہ سجا ہوا ہو تو نکتۂ توحید سمجھ میں آنا ممکن نہیں۔

شاہد شمسی ' اسلام آباد

''اندازِ بیان'' (سنابل العلم' جولائی ۲۰۰۲ء) میں تیسرا انداز: خطیب بہت غیر مناسب لگا۔ ہمارے یہاں عرف عام میں خطیب' امام' معلم اور مسجد میں وعظ دینے والے کے لیے استعمال ہوتا ہے' جو ایسا نہیں ہوتا ہے جیسا آپ نے بیان کیا۔ آپ نے پیشہ ور مقرر یا باحث کے معنی میں لیا ہے۔

پروفیسر رفیعہ حسن ' لاہور

''بحرالکاہل میں مسلمان اقلیتیں'' (جولائی ۲۰۰۲ء) پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ بہت دل چسپ اور معلومات افزا ہے۔ فیجی مسلم لیگ کے قیام کے تذکرے میں (ص ۵۰) جن دو بھائیوں کی خدمات کا ذکر ہے' ان کا صحیح نام سعید حسن بیرسٹر ایٹ لا اور حاجی محمد حسن ہیں (اول الذکر میرے خسر تھے جن کے بھائی سعادت حسن منٹو تھے)۔

ابوداؤد ' لاہور

''کلام نبویؐ کی کرنیں'' (جولائی ۲۰۰۲ء) احادیث کا بہت عمدہ اور ایمان افروز انتخاب اور بڑی موثر تشریح

ہے۔ قاری پر پڑھتے پڑھتے رقت طاری ہو جاتی ہے' آنکھیں نم آلود ہو جاتی ہیں اور دل کی عجب کیفیت ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا عبدالمالک صاحب کو بہترین جزا سے نوازے۔ حدیث کے فہم کے ساتھ ساتھ دلوں میں عشق رسولؐ اور حب رسولؐ کی افزونی اور ایمان کی حلاوت و تازگی پیدا کر دیتے ہیں۔

محمد وسیم راؤ' کراچی

''کتاب نما'' (مئی ۲۰۰۲ء) میں مستشرقین اور قرآن حکیم مجلے پر تبصرہ پڑھا۔ اس میں علما و مشائخ پر غفلت کا الزام لگایا گیا ہے اور پھر جدید تعلیم یافتہ طبقے کی تعریف کرتے ہوئے جس طرح علما و مشائخ کے بلا استثنا ایمان اور غیرت دینی سے خالی ہونے کا اعلان کیا گیا ہے' یہ انداز مناسب نہیں۔ اگر اہل حق علما میں سے کچھ لوگ اپنی عملی زندگی میں کمزوری دکھاتے ہیں تو وہ یقیناً اپنے اعمال کے سلسلے میں خدا کے ہاں جواب دہ ہوں گے۔ امید ہے کہ اس طرف توجہ رہے گی اور علما کے حقیقی مقام کو اجاگر کرنے کے لیے ترجمان بھرپور کردار ادا کرے گا۔

راشد الیاس ' مانسہرہ

جہاد کشمیر کے مخالف بعض حلقوں کی جانب سے گذشتہ دنوں جہاد کشمیر کو حرام قرار دینے کے مولانا مودودیؒ کے موقف کو ازسرنو بڑے اہتمام سے بیان کیا گیا ہے۔ انداز یہ ہوتا ہے کہ جیسے جماعت اسلامی مولانا مودودیؒ کے خلاف عمل پیرا ہے۔ میرے خیال میں مولانا مودودیؒ کے کسی موقف کے خلاف پالیسی اختیار کرنے پر کوئی اصولی اعتراض نہیں ہوسکتا' تاہم اس خاص معاملے میں یہ حضرات مولانا مودودیؒ کا اور اس زمانے کی جماعت اسلامی کا آخری حقیقی موقف پیش نہیں کرتے۔ دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ بات اس خط پر ختم کی جائے جو ۱۶ ستمبر ۱۹۴۸ء کو مولانا مودودیؒ نے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو آخر میں لکھا۔ متعلقہ جملے درج ذیل ہیں: ''اب اہل پاکستان کے لیے جہاد کشمیر میں جنگی حصہ لینا بالکل جائز ہے--- اس کے ساتھ جماعت نے یہ بھی طے کیا ہے کہ اب وہ خود اس جنگ میں عملاً حصہ لے گی۔ جماعت اسلامی کا کام صرف مسئلہ بتانا نہیں ہے بلکہ اس پر عمل کرنا بھی ہے''۔ (خطوط مودودیؒ، ج ۲' ص ۳۲۷-۳۲۹)

ایک نمونہ' ایک مثال

جماعت اسلامی' ضلع کیچ (بلوچستان) کے امیر کی جانب سے گذشتہ دو تین ماہ میں ۴۰ نئے خریداروں کے نام اور رقم ارسال کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی سعی قبول فرمائے اور جن افراد نے رسالہ جاری کروایا ہے' ان کے گھرانوں کے لیے خیر و برکت کا سبب بنے--- کیچ کے برابر کام کی ہر یونٹ ۴۰ خریدار بنائے' تو آپ مرکزی منصوبے کے ہدف سے بہت آگے نکل جائیں گے۔ یقیناً دیگر مقامات پر یہاں سے زیادہ تعلیم اور بیداری ہے۔ کیچ والوں نے ابھی مزید نئے خریدار بنانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ (ادارہ)

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک' اچھرہ' لاہور سے شائع کیا



امن ومحبت اور دین ودانش کی بستی

موٹروے اسلام آباد

قرطبہ

تعارف:

مدینۃ العلم سوسائٹی ایک مثالی اسلامی بستی بسانے کا منصوبہ پیش کر رہی ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان کے امیر قاضی حسین احمد مدینۃ العلم سوسائٹی کے صدر، سید منور حسن سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری اور ممتاز ذمہ دار افراد گورننگ باڈی کے ارکان ہیں۔

محل وقوع:

زیرو پوائنٹ اسلام آباد سے تقریباً آدھ گھنٹے کی ڈرائیو (50 کلومیٹر) پر موٹروے چکری انٹرچینج پر خوبصورت پہاڑیوں کے دامن میں کھلے اور پُر فضا ماحول میں واقع ہے۔ قرطبہ کے گردونواح میں بستیاں موجود ہیں۔ جو شہری کثافتوں سے پاک لیکن بیشتر شہری سہولتوں سے آراستہ ہیں۔

موجودہ سہولیات:

★ مقامی ٹرانسپورٹ ★ مقامی سکول بوائز اینڈ گرلز ★ واران (Varan) بس سروس
★ چکری سروس ایریا میں شاپنگ سنٹرز ★ پٹرول پمپ ہسپتال، بنک، ڈاکخانہ، سٹیلائیٹ ٹیلی فون ★ پولیس سٹیشن وغیرہ۔

خصوصی سہولیات

★ کشادہ سڑکوں کا نظام ★ کھیل کے میدان ★ مساجد ★ کمیونٹی سنٹرز
★ ابتدائی تعلیمی سہولیات سے یونیورسٹی سطح تک کے تعلیمی ادارے ★ صحت عامہ
★ سیکورٹی انتظامات ★ قبرستان

امتیازی خصوصیات:

• دین وشریعت • فقہ وقانون • تعلیم وتحقیق • صنعت وتجارت
• انفرمیشن ٹیکنالوجی اور جدید علوم وفنون کے مثالی مراکز کا قیام

قیمت پلاٹ:

20,000 کنال پر مشتمل عظیم الشان منصوبہ میں ترقیاتی اخراجات سمیت یکمشت ادائیگی/قسطوں پر پلاٹ حاصل کیجئے۔ خواہشمند حضرات کے اصرار پر سابقہ اور نئے خریداروں کی سہولت کے لئے ادائیگی اقساط کی مدت تین سال کر دی گئی ہے۔ پلاٹ کی قیمت میں کسی اضافے کے بغیر اقساط میں 33.3% کمی کی سہولت حاصل ہوگئی ہے۔

بمعہ ترقیاتی اخراجات

پلاٹ سائز	قیمت پلاٹ	20% ادائیگی بکنگ	گیارہ سہ ماہی اقساط میں	آخری قسط
500 گز	500,000 روپے	100,000 روپے	33,400 روپے	32,600 روپے
250 گز	250,000 روپے	50,000 روپے	16,700 روپے	16,300 روپے
125 گز	125,000 روپے	25,000 روپے	8,350 روپے	8,150 روپے

یکمشت ادائیگی کی صورت میں قیمت پر 10 فیصد خصوصی رعایت دی جائے گی۔

طریقہ کار:

درخواست فارم کے ہمراہ شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی اور تین پاسپورٹ سائز تصاویر لگائیں اور چیک/ڈرافٹ کے ساتھ ہمارے پتہ پر ارسال فرمائیں۔

- ادائیگی کے لئے چیک ڈرافٹ بنام مدینۃ العلم سوسائٹی، پاکستان میں بنک الفلاح لمیٹڈ کی تمام برانچوں (اکاؤنٹ **01122443** برائے پاکستانی روپے) میں سہولت موجود ہے۔
- برائے پاکستانی روپے (Pak Rs.) اکاؤنٹ نمبر: 01122443
- برائے ڈالر (U.S. $) اکاؤنٹ نمبر: 01800375

درخواست فارم بمعہ معلومات بروشر درج ذیل دفاتر کے علاوہ جماعت اسلامی کے دفاتر سے مفت حاصل کیا جا سکتا ہے

مدینتہ العلم سوسائٹی (رجسٹرڈ)

لاہور (ہیڈ آفس)
منصورہ ملتان روڈ لاہور، پاکستان
فون: 5419520-4/7844605-9 فیکس: 7832194 (92-42)
E-mail: amir@ji.org.pk URL: http://www.jamaat.org

اسلام آباد (پروجیکٹ آفس)
میجر (ر) ابرار اعوان (پروجیکٹ ڈائریکٹر)
فلیٹ نمبر 4، فسٹ فلور، خیبر پلازہ فضل حق روڈ بلیو ایریا اسلام آباد
فون نمبر: 051-2270420 موبائل نمبر: 0300-9501354

C.P.L. 236

Phone: 7587916
Fax: 7585590

Monthly TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE.